آئینے میں جنم لیتا آدمی

مسعود قمر

آئینے میں جنم لیتا آدمی

آئینے میں جنم لیتا آدمی

مسعود قمر

سائبان تحریک

249 جی ماڈل ٹاؤن، لاہور

www.saibantehrik.com saibantehrik@gmail.com رابطہ: 0300-4375871

جملہ حقوق بحق شاعر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	آئینے میں جنم لیتا آدمی
شاعر	:	مسعود قمر
اشاعتِ اوّل	:	نومبر 2022ء
سرورق	:	فائزہ خان
پس ورق	:	شبیر رضوی
ناشر	:	شاہد ماکلی
مطبع	:	ثناءاللہ پریس لاہور
قیمت	:	700روپے

سائبان تحریک

249 جی ماڈل ٹاؤن، لاہور

رابطہ: 0300-4375871 saibantehrik@gmail.com www.saibantehrik.com

انتساب

اپنے مٹھے کے نام

تشکر

میں اپنے بیٹے خرم مسعود

اپنی محترمہ اشرف مسعود

اپنے نواسے سبحان، ابراہیم، علوین، ریان، اریان

اپنے پوتے وشال، سانول، ملہار، اویس، انس، پوتی ردا

اپنی دوست مہر زیدی، فائزہ خان، سمیرا قریشی، فطرت سوہان،

رفعت ناہید، نازیہ نگارش

اور

مٹھے کا بہت بہت بہت شکر گزار ہوں

ان تمام احباب نے اس کتاب کو مرتب

کرنے میں اپنے اپنے انداز میں میری مدد کی ہے

ترتیب

موت میں مزید موت کی پیراڈاکسیائی نظمیں — ناصر عباس نیّر 11

مارکسزم کی معروضیت سے وجودیت کی داخلیت تک — تنویر انجم 16

آئینے میں جنم لیتا آدمی: چند تاثرات — ڈاکٹر عبدالعزیز ملک 24

نظمیں

1۔ وہ عورت کبھی اکیلے نہیں سوتی 33

2۔ راگ الاپتے پودے 35

3۔ سگریٹ سُلگانا آسان نہیں 38

4۔ مرحوم کی آخری موت 40

5۔ بغیر آواز برستی بارش 43

6۔ ایک گیت لایعنی موت کے لیے 46

7۔ ایش ٹرے صاف کرتے رہنا ایک بیماری ہے 49

8۔ بے حمل پیدائش 51

9۔ لاٹری میں نکلی قبر 53

10۔ عمل زمین پہ تھا قہقہے آسمان پہ تھے 57

11- سمندر کا قہقہہ 59
12- مرے ہوئے انسان کا خودکشی کرنا 60
13- نابینا سے اُدھار لیا گیا خواب 62
14- وہ، میں اور درخت 66
15- ایک نشہ باز کرسی 69
16- زادِ راہ 72
17- ادھورے کاموں والی مکمل عورت 75
18- ایک کمر انظم کے لیے 78
19- پانی سے خالی سمندر 82
20- خدشوں کی کاک ٹیل 84
21- معلّق ہوئی کھسیانی ہنسی 86
22- برف میں دبے زرد پتوں کی چُرمراہٹ 90
23- جلوس سے بھاگے ہوئے لوگ 92
24- فیس بک کی سڑک پہ پڑا جنازہ 94
25- آسمان بنتی نظم 98
26- بستروں پر پڑی ادھوری نیند 100
27- چیخ کا وزٹینگ کارڈ 103
28- موت چُرانے والی عورت 107
29- خودکشی کرتا آسمان 110

30۔ جھیل میں پڑی پازیب 112
31۔ ایک گیت اُداس کتاب کے لیے 114
32۔ گھوڑے کی کاٹھی اور تکیہ 117
33۔ پنکچر شدہ سائیکل اور کچنار کا درخت 119
34۔ ٹوٹے دندانوں والا کنگھا 122
35۔ کھارے پانی کی برف 124
36۔ سیڑھی پہ بنا گھر 126
37۔ طبعی موت سے خالی چوک 128
38۔ ''تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ'' 131
39۔ سرگوشیوں کا قبرستان 133
40۔ سیاہ راتوں کا نیلا خواب 136
41۔ برف کی کیلوں سے زخمی پاؤں 139
42۔ میں درخت کو کچھ نہیں دے سکتا 142
43۔ تکمیل سے پہلے کا ایک دن 146
44۔ درخت کی چھاؤں جڑوں میں ہوتی ہے 149
45۔ تجسس افواہ گری کی ایک شکل ہے 151
46۔ آئینے میں جنم لیتا آدمی 154
47۔ میں درخت کو کچھ نہیں سکتا 156
48۔ کافی کے آخری گھونٹ میں ملی محبت 160

49۔ برفیلے پانی میں تیرتا استعارہ.....162
50۔ ایک بے عمرا آدمی.....164
51۔ میں نے خودکشی کیوں ملتوی کی.....166
52۔ اسکارف کی گرہ میں بندھی محبتیں.....169
53۔ میں کبھی بھی ''میں'' سے نہیں ملا.....172
54۔ موت کے بعد کیا گیا ٹینگو ڈانس.....174

موت میں مزید موت کی پیراڈاکسیائی نظمیں

مسعود قمر کی نثری نظمیں، اس قدر نئی، انوکھی، عجب، طرفہ ہیں کہ انھیں پڑھنے اور سراہنے کے لیے آپ کو شاعری کے عمومی تصورات کو معطل نہیں، برابر پیش نظر رکھنا پڑتا ہے، تاکہ ان کی شکست کی جا سکے۔ ان نظموں کی ہر ہر سطر، ایک اعتبار سے شاعری کے اس عمومی تصور کے خلاف قہقہے کی مانند ہے، جو ہماری حسِ لطیف کو مخاطب کرتی ہے اور ہمیں ملکوتی احساسِ حسن سے شرابور کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظمیں روایتی و عمومی شعری جمالیات کا باقاعدہ تمسخر اڑاتی محسوس ہوتی ہیں، اور اسی تمسخر کے دوران ہی میں وہ اپنے طرفہ شاعری ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ طرفگی یا marvellousness ان نظموں کے اسلوب کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ لیکن یہ طرفگی اچھی خاصی صدمہ انگیز بھی ہے۔ ان نظموں کے امیج، استعارے، تمثیلیں، سب ہماری عمومی توقعات اور کئی جگہوں پر اخلاقیات کو صدمہ پہنچاتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں نہ تو نامیاتی ترتیب نام کی کوئی چیز ہے۔ نہ منطقی تسلسل اور نہ کوئی واحد مضمون جو ابتدا وسط و انجام تک، تسلسل یا خلا کے ذریعے مکمل ہوتا ہو۔ اس کے باوجود یہ کسی انتشار کو پیش نہیں کرتیں۔ کیا ضروری ہے کہ جہاں منطقی ترتیب نہ ہو، وہاں لازماً انتشار ہو۔ وہاں کوئی اور حالت، تعطل، وقفے اور حرکت کی ملی جلی حالت ہو سکتی ہے۔ یہ اپنی بے ترتیبی سے ایک نیا، روزمرہ منطق کو شکست دیتا نظم وجود میں لاتی محسوس ہوتی ہیں۔

یہ نظمیں دنیا کے بارے میں کوئی کلام کرنے سے پہلے خود نظم کے باب میں کلام کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ اپنی جانب نگاہ کرتی ہیں اور اپنے دیار کو دیکھتی ہیں اور انھیں جنھوں نے اس دیار کی تعمیر کی۔ یہ بار بار ان اشخاص، کرداروں، ٹکڑوں کو یاد کرتی ہیں جنھیں اس نوع کی شاعری اور ادب کے آدم وحوا کہا جاسکتا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ دستوفسکی اور کافکا اور ان کے بعد پشکن، لورکا، محمود درویش، ایرش فریڈ اور دوسرے۔ یہ ایک لحاظ سے عالمی نظمیں ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ یہ آج کل زیر بحث آنے والی مقامیت سے کچھ زیادہ لگا نہیں کھاتیں۔

یہ سب نظمیں مجموعی طور پر ڈسٹوپیائی ہیں۔ دستوفسکی اور کافکا، ڈسٹوپیائی ادب کے امام ہیں۔ کافکا تو ان نظموں کا سب سے اہم کردار بھی محسوس ہوتا ہے۔ کافکائیت، ان نظموں کے مجموعی مزاج میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ کہ یہ دنیا اصل میں تاریک، آسیبی، انسان کش اور کٹی پھٹی اور ایک عقدۂ عظیم ہے!

ڈسٹوپیائی ادب، جدید عہد کے انسان کے اس حقیقی طرز عمل میں جڑیں رکھتا ہے جسے یوٹوپیائی تصوراتِ دنیا کو حقیقی دنیا میں آزمانے کے بعد کوئی شخص محسوس کرتا ہے۔ دنیا میں رجائیت کے جب بھی عظیم دعوے کیے گیے ہیں، ایک عظیم، مثالی دنیا کا خواب دکھایا گیا ہے، حقیقت میں دنیا مزید تاریک ہوئی ہے۔ انسان روشنی کے حصول میں جس قدر سفر پیما ہوا ہے اور دنیا کے آخری کناروں تک پہنچا ہے، تاریکی مزید بڑھی ہے۔ اس سے انیسویں صدی کے اواخر سے انسانی عقل میں پختہ اعتقاد متزلزل ہوا، سیاسی دعوے جھوٹ ثابت ہوئے، رجائیت اور عدم تشدد کے تصورات خود اپنا انہدام کرتے محسوس ہوئے۔ ہر دعوے میں اس کو جھٹلانے کا پورا پورا سامان

تھا۔ المیہ ہے کہ اس حقیقت کے سامنے آنے کے باوجود، لوگ دعووں پر یقین کرتے ہیں۔ وہ جھوٹ کو زندگی کی سچائی سمجھ کر تسلیم کر لیتے ہیں اور خوش رہنے کا ناٹک کر کے، زندگی کا شکوہ نہیں کرتے۔

سفر میں قیام، قیام میں اضطراب، ترقی میں انحطاط، زندگی میں موت، موت میں مزید موت کی آرزو، گھر اور جسم کے قبر ہونے جیسے پیراڈاکسیائی اور مضحک خیالات عام ہوئے۔ نیز مختلف ومتضاد خیالات، متنوع احساسات کے باہم آمیز ہونے، ٹکرانے اور بیداری اور خواب کی سرحدوں کے پگھل جانے، حافظے اور تخیل کے آمیز ہونے، عدم اور وجود کے ایک دوسرے میں ضم ہونے کے تصورات عام ہوئے۔ کوئی انسانی تجربہ یک رخا، منطقی، سیدھا سادہ نہ رہا۔ اسے ڈسٹوپیائی ادب نے پیش کیا ہے۔ ان نظموں میں بھی آپ کو کوئی چیز سماجی طور پر جانی پہچانی حد میں مقید محسوس نہیں ہوتی۔ مرد وعورت اکٹھے سوئے بغیر ہم بستری کرتے اور آنے والے بچے کا نام سوچتے ہیں۔ ریل کار کے خالی ڈبے میں اکیلا مسافر خود ہی سے ہر ہر نشست پر جا کر ملاقات کرتا ہے۔ ایک درخت، سارے موسموں سے لدا ہوا ہے۔ مرحوم اپنی آخری موت کے بارے میں سوچتا ہے اور زندگی کی اس سڑک کا تصور کرتا ہے جو بنا استعمال کے ٹوٹ گئی۔ آواز بھری بارش کو کتابوں میں بھی برسنے کی اجازت نہیں ہے۔ کافکا، آدمی کا ننگ ڈھانپتا ہے۔ آدمی ایک سو بیس سال کی عمر تک اپنی قبر کھودتا رہتا ہے اور دوسروں کو دفن کرتا رہتا ہے۔ نابینا شخص کو آنکھیں دے کر، وہ اس کے خواب اٹھا لیتا ہے، جسے نابینا بھول گیا تھا۔ لہلہاتا درخت، نظم کو جنم دیتا ہے۔ نظم کشتی میں بیٹھتی ہے تو دنیا چپو بن جاتی ہے۔ جنازے فیس بک کی سڑک پر پڑے رہتے اور اپنی بولیاں سنتے رہتے ہیں۔ یہ سب عجیب ہے مگر مضحکہ خیز انداز میں۔ اسے اصطلاح

میں گروٹیسک کہنا چاہیے۔ یعنی یہ ایسی کیفیات ہیں جو متلا دینے والی ہیں، تمسخر سے بھری ہیں، خود اپنی تردید ہی نہیں اپنا ٹھٹھا اڑانے پر تلی ہیں، جن میں سب حدیں بھک سے اڑ گئی ہیں، المیہ طربیہ، سنجیدہ و مضحک کی کوئی حد باقی نہیں رہی، اور جسے معرض فہم میں لانا آسان نہیں۔ مکمل گروٹیسک۔ آپ ان پر جھلاتے ہیں، آپ کو غصہ بھی آتا ہے، کسی وقت رحم آتا ہے اور کسی وقت آپ کا دل اکتا جاتا ہے۔ زندگی میں موت، موت میں ملتوی ہوتی موت۔ یعنی خودکشی کی کوشش۔ محبت میں محبت کا عدم وجود اور دنیا میں اپنا ہونا، جیسے کسی قبر میں ہونا اور قبر کو کھودتے عمر گزار دینا۔ یہ صرف پیراڈاکس نہیں، یہ مضحکہ خیز محالات ہیں۔ ایسے محالات جنھیں جدید فنکاروں نے اپنے عصر کی زندگی کی اصل کے طور پر پہچانا اور ان کو پیش کرنے کے لیے نئی شعری زبان وضع کی۔ ہر اس شے کو شعری امیج بنایا جو باہر کی حقیقی زندگی میں موجود ہے۔ وہ روزمرہ معمولات ہوں یا اشیا و عادات۔ سب کو شعری امیج میں ڈھالا۔

موت، خودکشی، محبت، درخت، عورت، ان نظموں میں بار بار ظاہر ہوتے ہیں۔ سب نظمیں انھی کے گرد گھومتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسعود قمر کی نظموں کے درونی متون ہیں۔ ہم نے زیادہ تر بین المتنیت کی بات کی ہے۔ یہ کہ کسی ایک متن میں کوئی دوسرا، سابق متن شریک ہوتا ہے۔ لیکن ایک ہی مصنف کے یہاں خود اس کے سابق متن، نئے متن میں شامل ہوتے ہیں۔ اسے intratextuality کہا جاتا ہے۔ موت اور خودکشی کے سلسلے میں تو obsession کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ obsession شاعر کا نہیں، ان کی نظموں کا ہے۔ اس کا سبب، صرف اپنے عصر کے مذکورہ بالا محالات کو پیش کرنا نہیں، بلکہ یہ دکھانا بھی ہے کہ باہر ہم زندگی کا جشن جس قدر منا رہے ہوں، گلیاں، قہوہ خانے، پب، آباد ہوں (ان نظموں میں یہ

جگہیں زیادہ ظاہر ہوئی ہیں اور وجہ شاعر کا یورپ میں موجود ہونا ہی ہوسکتا ہے)، وہ ہمارے واقعی زندہ، محبت سے لبریز اور خوش ہونے کی علامت نہیں ہیں، بلکہ موت، مایوسی، تاریکی کو فراموش کرنے کی صورتیں ہیں۔ مسعود قمر کی نظمیں انھی فراموش کردہ چیزوں کا قصہ بار بار سناتے ہیں اور نہایت خطرناک انداز میں۔

ایرانی مصنفہ آذر نفیسی نے اپنے کتاب Read Dangerously میں لکھا ہے کہ نہ تو محبت اور نہ ہی دہشت ہمیں اندھا کرتی ہیں بلکہ بے تعلقی ہمیں اندھا بنا دیتی ہے۔ یہ اچھا ادب ہی ہے جو ہمیں خطرناک طریقے سے سوچنا سکھاتا ہے۔ لازم نہیں کہ وہ براہ راست سیاسی عمل پر اکسائے مگر وہ ایسا ذہن تیار کرسکتا ہے جو ان سب تیقنات کی دنیا پر سوال اٹھاتا ہے جو سیاسی مقتدرہ کی مدد کے لیے سماج میں موجود ہوتے ہیں۔ مسعود قمر نے اگرچہ جنرل ضیا پر بھی ایک نظم ''عمل زمین پر تھا قہقہہ آسمان پر تھا'' لکھی ہے، تاہم زیادہ تر عام زندگی کے عام رویوں سے متعلق ہیں اور خطرناک انداز میں چیزوں کو محسوس کرنے اور سوچنے پر مائل کرتی ہیں۔

ایسی کتابوں کے اُردو میں پڑھے جانے کی بہت ضرورت ہے۔

ناصر عباس نیّر

لاہور، 14 اکتوبر 2022ء

مارکسزم کی معروضیت سے وجودیت کی داخلیت تک

ایک دفعہ پھر مسعود قمر کی شاعری پر لکھ رہی ہوں، یہ دوسری بار ہے۔ اس دفعہ کتاب زیر اشاعت ہے اور اس کا نام اتنا ہی انوکھا ہے جتنی مسعود قمر کی تمام شاعری، ''آئینے میں جنم لیتا آدمی''!

ہر اچھے شاعر میں انفرادیت تو ہونا ہی چاہیے، اس لیے مسعود قمر میں بھی ہے، مگر اس کا دماغ کس طرح کام کرتا ہے یہ سمجھنا آسان نہیں ہے۔ ایسا محسوس تو ہوتا ہے کہ اس کی نظموں میں اکائیت اور معنویت ہے مگر اس پہ انگلی رکھ کر نظموں کا تجزیہ کرنا مشکل ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مسعود قمر کا تخیل لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اور ہم نظم ختم کر کے سوچتے ہیں یہ کیا ہوا؟ اور پھر دوبارہ پڑھ کر دیکھنے لگتے ہیں۔

اور ان نظموں کو دہراتے ہوئے جب میں معنی کی تلاش میں بھٹک رہی تھی تو تقریباً ہر نظم کے بعد مجھے سارتر ہی یاد آتا رہا تھا اور اس کے فلسفے کا کلیدی نکتہ کہ وجود جوہر سے پہلے ہے۔ مسعود قمر جوہر کی تلاش میں ہے۔ اس کی ہر نظم کہتی ہے کہ وہ ایسا شخص ہے جو اپنے جوہر کی تلاش نہیں چھوڑ سکتا چاہے اس کے لیے اس کی طبعی موت ہو جائے، وہ مار دیا جائے یا اسے خودکشی کرنا پڑے۔ ایک نظم میں وہ کہتا ہے کہ ''خودکشی اس کے ساتھ رحم مادر میں پیدا ہوئی'' ایک اور نظم میں کہتا ہے کہ ''اس نے موت کو حفاظت سے چھپا کر رکھا تھا مگر ایک عورت نے اسے چرا لیا''۔ ایک اور نظم کہتی

ہے کہ وہ نہ طبعی محبت کرنا چاہتا ہے نہ طبعی موت مرنا، وہ کسی طبعی صورت حال کے سامنے بے بس ہونے کو تیار نہیں۔۔ انتخاب کی اولیت ہی اس کا دین ہے۔

مسعود قمر کبھی پکا مارکسٹ بھی تھا سو اس کا سفر مارکسزم کی معروضیت سے وجودیت کی داخلیت تک ہے، کم از کم شاعری میں اس کی داخلی واردات کا اظہار شدت سے ہوتا ہے اور اس کا پیچیدہ تخیل اس کی نظموں میں انوکھی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

ایک زمانے سے مسعود قمر کا وطن سویڈن ہے اس کی نظموں میں کبھی پنجاب کے گاؤں اور شہر نظر آتے ہیں اور کبھی اسکینڈی نیویا کے موسم۔ اس کی دہری یا کثیر الجہت شناخت اس کی شاعرانہ حسیت کا حصہ ہے، جو اس کی لفظیات کو بھی ایک انفرادیت بخشتی ہے، وہ شراب کو کبھی شراب اور کبھی وائن لکھتا ہے اور شراب کی مختلف اقسام کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ اس کی شاعری کی عورتیں بھی گونا گوں شناخت کی حامل ہیں اور دیگر کردار بھی۔

مسعود قمر کی شاعری میں علامات و استعارات کی بہتات ہے۔ اس کے امیجز بھی گنجلک مگر خوبصورت ہیں مگر اس کی شاعری کا سب سے اہم لفظ غالباً عورت سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک عورت اس کی ہر نظم میں موجود ہوتی ہے، وہ اسے کبھی نام سے نہیں پکارتا مگر یہ اہم اسم نکرہ ہے جو وہ استعمال کرے یا نا کرے اس کا وجود اس کے مصرعوں سے جھلکتا رہتا ہے۔

مسعود قمر نے اپنی نظموں کے عنوانات میں سے جس کو کتاب کا نام بنایا ہے اس کا تذکرہ اور تجزیہ بھی اہم ہے۔ ''آئینہ'' ایک ایسی علامت ہے جسے ایک طرف تو افلاطون نے اپنے فلسفے کی بنیاد بنایا اور اس طرح وہ مغربی فلسفے کی اساس بن گیا، جسے

ہم کہتے ہیں اور دوسری طرف اُردو شاعری آئینے کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ شاید ہی اُردو کا کوئی شاعر ہوگا جس نے ''آئینے'' کی علامت کو استعمال نہ کیا ہو۔ وہ غزل ہو یا نظم ''آئینہ'' ہر صنف سخن میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ آئینہ ردیف کے طور پہ بھی استعمال ہوا ہے:

از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

(غالب)

یا جو اقبال نے انسان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

یا جو اقبال نے خدا کو جواب دیتے ہوئے کہا

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ان اشعار سے جو کہ زبان زد عام ہیں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آئینے کی علامت ہزار معانی رکھتی تھی اور کثرت استعمال سے اس کی معنویت کم نہیں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ مسعود قمر کا عنوان بھی ان کے دیگر عنوانات کی طرح بہت کچھ کہتا ہے۔ ان کی نظم کا خلاصہ بیان کروں تو وہ لکھتے ہیں کہ میں نے ہزار سال خود کو پیدا کرنے کی کوشش کی مگر خود کو پیدا نہیں کر سکا تو ایک آئینہ بنایا اور اس میں خود کو جنم دیا اور اگرچہ وہ گملے کی پتی کو

اپنی کہانی سناتے ہیں مگر ان کا کہنا ہے کہ میں کہیں بھی نہیں ہوں، سوائے آئینے، گملے کی پتی اور چائے کی بھاپ میں۔ آئینے میں یعنی ایک غیر حقیقی روپ میں پیدا ہونا اور اپنے ہونے کی جدوجہد میں زندگی گزارنا اس بے مقصد سفر میں اپنے جوہر کو تلاش کرنا ہے اور یہی مسعود قمر کی نظموں کی جدوجہد ہے۔

اس کی نظموں میں ''راگ الاپتے پودے'' ہیں، ریل کے پہیوں کی گائیکی ہے، اور اس گائیکی کو سمجھنے والے لوگ ہیں جو لفظوں کا خالی پن بھی محسوس کر سکتے ہیں اور وہی ہیں جو محبت کر سکتے ہیں۔۔ اس کی نظم ''بغیر آواز کے برستی بارش'' ریاستی جبر، تشدد اور اس کے خلاف مزاحمت کی کہانی سناتی ہے۔ یہاں درختوں کی زبانیں کاٹ دی گئی ہیں اور ندی اپنا ٹھنڈا، میٹھا پانی آخری تہہ میں رکھنے پر مجبور کر دی گئی ہے، اور شاعر پشت سے نکلتے لہو سے لفظوں کو محفوظ کر رہے ہیں۔ اس کی ایک نظم کا عنوان ''ایش ٹرے صاف کرتے رہنا ایک بیماری ہے'' شاعر کے اندرونی خلفشار کی عکاسی کرتی ہے جب کہ نیند میں چلنا اس کے لیے بیماری نہیں ہے۔ ''بے حمل پیدائش'' میں وہ کہتا ہے کہ میں ماں کے پیٹ سے مردہ نکالا گیا، مگر غربت کی وجہ سے دفنایا نہیں گیا۔ موت کی imagery ان کے ہاں بار بار آتی ہے مثلاً ''لاٹری میں نکلی قبر'' ایک پوری کہانی کہتی ہے کہ وہ اپنی قبر کھودتا ہے اور دفن ہونے کی تیاری کر ہی رہا ہوتا ہے کہ کسی اور کو اس قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ نتیجۃً اس نے زندگی ہی میں مرے ہوئے رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور لاٹری میں قبر کے نکلنے کا منتظر ہے۔ نظم ''عمل زمین پہ تھا قہقہے آسمان پہ تھے''، 17 اگست 1988 کو لکھی گئی جو دن ضیاء الحق کی موت کی نوید لے کے آیا تھا، جب اس کا بدبودار بدن پھٹا تھا اور ہر طرف جشن کا سماں چھا گیا تھا۔ آسمان سے قہقہوں کی بارش ہوئی۔ مگر باریش پیٹوں اور گول ٹوپیوں نے اس بدبو کا ذخیرہ کر لیا تھا اور اب عدالتیں، اسکول اور ایوان اس بدبو سے سینکڑوں بدبودار بدن

بنانے میں مصروف تھے۔ ''مرے ہوئے انسان کا خودکشی کرنا'' وہ نظم ہے جو سرمایہ داری اور جبر کے شکنجے میں جکڑے انسانوں کی مردنی کی بات کرتی ہے ''شہر مرے ہوئے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں''، مرے ہوئے لوگوں کو اپنی تدفین کے لیے خودکشیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اپنی نظم ''ایک نشہ باز کرسی'' میں مسعود قمر کہتا ہے کہ میرے سارے وصل اور ہجر اسی کرسی نے بسر کیے، مگر اب یہ کرسی نشہ باز کرسی ہوگئی ہے۔ میں اب بھی ان نشوں سے مالا مال ہوں لیکن کاٹھ کی اس کرسی کا نشہ پورا کرنے سے قاصر ہوں کہ میں خود مفلس النشہ ہو چکا ہوں۔ ایک کرسی اور انسان کے رشتے کو اس طرح شاید کسی اور شاعر نے نہیں دیکھا ہوگا۔

مسعود قمر شے کو اس کی ''شیئت'' سے بڑھ کر دیکھنے کے قابل ہے اور شے کی زندگی کو محسوس کر سکتا ہے۔ نظم ''زادراہ'' میں مسعود قمر کا کہنا ہے ہر انسان کو ایک بنی بنائی قبر، ایک مختصر سا سمندر، اور ایک پھول ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔ پھر وہ ان تینوں اشیا کا استعمال بتاتے ہیں۔ پھول ایک فیکٹری کی ساتھی سوزانا کو پیچ کس واپس کرتے ہوئے دیا جا سکتا ہے، سمندر صحرا میں حاصل کردہ چھالوں کے نتیجے میں کشتی نظر آنے پر مددگار ہو سکتا ہے اور بنی بنائی قبر کو ساتھ لیے ٹرین سے چھلانگ لگائی جا سکتی ہے جب بے ٹکٹ سفر کرنے پر ٹکٹ چیکر کی آواز سنائی دے۔ اس نظم کی تماثیل میں مسعود قمر کا مارکسی وژن اور وجودی تخیل دونوں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ''ایک کمرا نظم کے لیے'' بھی ایک نظم ہے جو بہت کچھ کہتی ہے۔ یہ شروع ہوتی ہے اس کی اپنی نظموں کے تذکرے سے جو وہ لکھ کر گلاسوں اور چائے کے کپوں میں رکھ دیتا ہے اور ایک دن وہ کپ اور وہ گلاس اس کی نظمیں پی جاتے ہیں۔ وہ نظموں کے لیے ایک کمرا بنانا چاہتا ہے جس میں وہ اپنے پسندیدہ شاعروں کی نظمیں رکھ سکے اور ایک بک شیلف

جس کے سارے خانوں کو ان نظموں، گلاسوں اور کپوں سے بھر دے، اور آخر میں وہ بتاتا ہے مگر میرا اندر تو تجاوزات سے بھرا پڑا ہے، میں کمرا کہاں بناؤں؟ گویا کہ کمرا صرف اندر ہی بن سکتا ہے۔ یہ بے بسی اور دل و دماغ اور زندگی کے چھین لیے جانے کی انسانی صورت حال ہے جس کی حقیقتوں کو مسعود قمر نے بہت خوب صورتی اور تفصیلات کے ساتھ آشکار کیا ہے۔ نظم ''جلوس سے بھاگے ہوئے لوگ'' میں مسعود قمر طبعی محبت اور طبعی موت کو خود مختاری اور خودکشی کے مقابل کھڑا کرتا ہے۔ اور کہتا ہے: ''خودکشی خودمختاری کی انتہا ہے/ خودمختاری اس خلا کو پر کرتی ہے/ جو بغیر محبت کے ہم بستری کرنے سے پیدا ہوتا ہے''۔

مسعود قمر کا ایک استعارہ آسمان بھی ہے۔ جو بالیدگی اور ارتفاع اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے'' آسمان بنتی نظم'' میں محبت کے لیے جرات کی کمی اڑان کی نا اہلیت میں ظاہر ہوتی ہے محبت میں ناکامی استری سے بیسیوں اسکارف جلا دینے میں۔ اور کسی کے لیے نظم لکھنا آسمان میں لیٹا ہوا محسوس کرنا ہے، جبکہ زمین، درخت، پہاڑ بھی انسان کے ساتھ تیر رہے ہوں۔ نظم ''چیخ کا وزیٹنگ کارڈ'' سیاسی جبر و تشدد اور اس کے خلاف مزاحمت کی داستان ہے۔ لوگوں کا غائب کیا جانا اور پھر بیرکوں میں ان کی چیخیں سنائی دینا اور آخری چیخ کے بعد خون کا دیکھا جانا وہ تماثیل ہیں جن میں متعدد ناولوں، نظموں اور فلموں کی گونجیں شامل ہیں مگر مسعود قمر یہیں نہیں رکتے بلکہ وہ اس مزاحمت کا بدلتا ہوا چہرہ بھی دکھاتے ہیں۔ مہنگے کافی ہاوسز کے بند دروازے، اعلیٰ قسم کے سگاروں کا دھواں، تہہ خانوں کا جعلی شراب اور نمازیوں کے لیے سفید گول ٹوپیاں بنانے کے لیے استعمال نئی حقیقتیں ہیں، جنہوں نے ماضی کے تمام مزاحمتی رویوں کی نفی کر دی ہے۔ 'موت چرانے والی عورت'' ایک نہایت خوبصورت نظم ہے جس میں مسعود قمر یاد کرتے ہیں ایک عورت کو جس نے کبھی ان کی سگریٹ، وائن اور کوئی بھی شے نہیں چرائی مگر ان

کی موت جسے وہ مختلف جگہوں پر چھپا چھپا کر رکھتے تھے چرا کر لے گئی۔

نظمیں ''خودکشی کرتا آسمان''، ''جھیل میں پڑی پازیب''، ''ایک گیت اداس کتاب کے لیے''، ''گھوڑے کی کاٹھی اور تکیہ''، ''طبعی موت سے خالی چوک''، ''کافی کے آخری گھونٹ میں ملی محبت''، ''میں نے خودکشی کیوں ملتوی کی'' تمام وہ نظمیں ہیں جو بلا واسطہ یا بالواسطہ موت کے خیال سے بحث کرتی ہیں۔ خودکشی، جبریہ موت اور موت کا التوا وہ موضوعات ہیں۔ جو مسعود قمر کی نظموں میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسعود قمر زندگی سے سچائی اور خوبصورتی چاہتا ہے اپنی نظم ''ٹوٹے دندانوں والا کنگھا'' میں وہ لکھتا ہے کہ ''ہم پھٹی، بدبودار جرابیں، پھٹی بدبودار بنیان اور ٹوٹے دندانوں والا کنگھا نہیں بدلتے اور کم کھا کر پیسے جمع کرتے ہیں نیا آئینہ خریدنے کے لیے تاکہ اپنی بدبودار چیزوں سمیت خود کو اس میں خوبصورت دیکھ سکیں۔ مسعود قمر کے لیے خوبصورتی کا جوہر چیزوں میں نہیں بلکہ اس سے ماورا کسی شے میں ہے، وہ ہر روز خریدے گئے نئے آئینے میں ہے، شاید یہ وہی آئینہ ہے جس میں اس نے جنم لیا ہے اور جو اسے سکھاتا ہے کہ خوبصورتی کا اصل جوہر سچائی ہے اور سچائی کا اصل جوہر جھوٹ کی مزاحمت ہے، جو کبھی کسی تعلق کو باطل کرتی ہے کبھی جبر پہ آمادہ اداروں کو کبھی ریاستی اداروں کو کبھی موت کو اور کبھی موت کا انکار کرنیوالی زندگی کو۔ اسے زندگی سے پیار ہے، عورت سے پیار ہے اور موت سے بھی پیار ہے، کیونکہ موت اسی کو آتی ہے جو زندہ ہو۔ ایک بڑی دنیا اور اس میں بسنے والے لوگ تو زندہ ہی نہیں ہیں تو وہ مر کیونکر سکتے ہیں اور جب زندگی موت جیسی ہونے لگے تو مسعود قمر کو موت کی خواہش سے اور خودکشی سے پیار ہو جاتا ہے۔ مگر وہ بارشی سیڑھی پر گھر بھی بنا سکتا ہے۔ اسے بارش زمین سے آسمان تک جانے والی ایک سیڑھی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی بارش ڈھونڈتا ہے جو نہیں ملتی اور اس عورت کو بھی جو بارش میں زندگی کو نہلا دیتی تھی۔ پھر وہ

فیصلہ کرتا ہے کہ اب کے بارش میں وہ اس عورت کے ساتھ بارشی سیڑھی کے عین درمیانی زینے پر ایک گھر بنائے گا اور سیڑھی کے اوپر اور نیچے سے خود کو الگ کر لے گا یہاں مسعود قمر کی نظم ایک سرئیل پینٹنگ نظر آتی ہے اور بارشی سیڑھی کا استعارہ اس کے اندر ارتقاع کے جنون کا مظہر بن جاتا ہے۔ انسان کے لیے یہی ارتقاع کا جنون اس کے اپنے جوہر کی تلاش ہے جو اسے زندگی میں بھی زندہ رکھے گی اور اسے اس قابل بنا دے گی کہ وہ موت کے بعد بھی ٹینگو ڈانس کرتا رہے اپنی محبوب عورت کے ساتھ۔

مسعود قمر کی نظمیں اپنی لفظیات اور شاعرانہ تراکیب کے ساتھ ایک جہان معنی پنہاں رکھتی ہیں۔ اس کی ندرتِ تخیل و اسلوب، اس کی بصارت و بصیرت سے ہم آہنگ ہو کر اسے اُردو میں ایک منفرد شعریت کو تخلیق کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسعود قمر کی نظمیں اُردو کی شعری دنیا میں زندہ رہ سکیں گی۔

تنویر انجم

18 اکتوبر 2022ء

''آئینے میں جنم لیتا آدمی'': چند تاثرات

مسعود قمر کی تخلیقی کائنات ان کی ذات کی طرح کومل، ملائم، نفیس اور منفرد ہے۔ ان کا خاصا ہے کہ وہ تجربات و احساسات کو پہلے روح کی بھٹی میں کندن بناتے ہیں اور پھر انھیں لفظوں کا روپ دے کر نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔ ان کا اُسلوب، لفظوں کا انتخاب اور خیال کی پیش کش کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ وہ خیال یا احساس کو بیان کرنے سے زیادہ اس کو دکھانے پر یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے جن کیفیات کو تمثالوں کی صورت میں پیش کیا ہے، وہ نہ صرف محسوس کی جا سکتی ہیں بلکہ اُن کا تصور (Visualize) بھی کیا جا سکتا ہے یہی وہ خصوصیت ہے جو اُنھیں نثری نظم نگاروں میں انفرادیت عطا کرتی ہے۔ اُن کی تخلیقیت کا منبع تنہائی ہے۔ ایک ایسی تنہائی جس نے صنعتی اور سرمایہ دارانہ تہذیب کی کوکھ سے جنم لیا ہے جہاں فرد اور سماج میں اجنبیت اور مغائرت حائل ہوگئی ہے۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے جہاں تخلیق کار اپنے احساسات و جذبات کا اظہار مکالمے کے بجائے خود کلامی کی شکل میں کرتا ہے۔ کچھ ناقدین تو خود کلامی کو نثری نظم کی شعریات کا اہم جزو بھی خیال کرتے ہیں۔ کارپوریٹ کلچر کے عہد میں مسعود قمر نے جہاں خارجی دنیا سے ربط اور ضبط قائم کیا ہے وہیں انھوں نے خود آگاہی اور خود شناسی کا سفر بھی طے کیا ہے۔ خود آگاہی کے سفر

نے ہی ان کے ہاں تنہائی کے احساس کو تقویت دی ہے:

میرا کچھ حصہ
ہمیشہ مجھ سے باہر رہا
میں
اسے اندر لانے
اور
اپنے بے کار حصوں کو
خود سے باہر نکالنے میں
مصروف رہتا ہوں

(ایک بے عمر آدمی)

انھوں نے خود کو دریافت کرنے کے لیے ہمیشہ تنہائی کو وسیلہ بنایا ہے جس سے ان کی تخلیقی کائنات میں تنہائی معنی آفرینی کا ذریعہ بن کر سامنے آئی ہے۔ ان کی نظموں میں تنہائی کی کیفیت کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کی مثال دیگر شعرا کے ہاں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ تنہائی کو کئی نامور شعرا نے شاعری کا موضوع بنایا جس میں مجاز کی نظم ''آوارہ''، منیر نیازی کی ''بازگشت''، عادل منصوری کی ''تنہائی''، جون ایلیا کی ''خلوت''، فرحت احساس کی ''خود آگہی'' اور فیض احمد فیض کی نظم ''تنہائی'' کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب ہر طرف مادیت کا غلبہ ہو، جذبوں کو کچلا جا رہا ہو، تہذیبی اور اخلاقی اقدار کو پامال کیا جا رہا ہو، انسانیت کا شیرازہ بکھر رہا ہو تو ایسی صورتِ حال میں ایک باہوش اور حساس انسان اپنی ذات کی جانب محوِ سفر ہو جاتا ہے۔ مسعود قمر کے ہاں بھی ایسی ہی

صورتِ حال موجود ہے۔ دلچسپ امر ہے کہ ان کے ہاں تنہائی، لایعنیت ،مایوسی، بے چارگی اور بے بسی کے دائرے میں داخل نہیں ہوتی بلکہ انکشاف ذات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

مسعود قمر کے ہاں دیگر شعرا کی نسبت محبت اور عورت کا الگ اور منفرد تصور اُبھرا ہے۔ ان کی نظموں میں محبت کے سمندر میں غوطے کھاتی لڑکی کا نوحہ نہیں بلکہ رومان، دلکش خوابوں اور حسین یادوں کی حامل عورت کا تصور موجود ہے۔ ان کے ہاں ابھرنے والا لڑکی کا کردار مریضانہ قسم کی یاسیت، ایذا پسندی اور خود اذیتی کا شکار نہیں بلکہ وہ ضبط کی کشتی میں جذبوں کی پتوار تھامے، تھکا دینے والی ہواؤں کے تھپیڑوں سے نبرد آزما ہے۔ وہ خود شعور و خود آگاہ ہے اور زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ وہ زندگی میں پیش آنے والے غم کو خود میں جذب کرتی ہے جو اس کی آنکھوں میں روشنی بن کر چمکتا ہے۔ انھوں نے نظموں میں وہی کچھ قلم بند کیا ہے جس کی ان کے باطن نے اجازت دی ہے۔ ان کی نظموں میں جس عورت کا تصور ابھرا ہے وہ ذرہ بھر جذبات کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لیتی۔

ان کی نظمیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کا نام زندگی ہے۔ شاعر محبت کی اس لطیف سرزمین میں زندہ رہنے کا خواہاں ہے جہاں اس جبس زدہ معاشرے کی کثافتیں اور رکاوٹیں نہ ہوں۔ ان کی نظموں میں محبت کا سادہ سا جذبہ ابھرتا ہے جو مادی علائق کو جذب کر لیتا ہے:

''میں
لوگوں کی بنائی محبت
کب تک قبول کرتا رہوں

میں
ایک محبت اپنی بنانا چاہتا ہوں''
(برف میں دبے زرد پتوں کی چُرمراہٹ)

''میں
کسی سے طبعی محبت نہیں کرتا
طبعی محبت کرنا ایسے ہے
جیسے
بلا تامل جیتے جانا''
(جلوس سے بھاگے ہوئے لوگ)

مسعود قمر کی نظمیں محبت سے عبارت ہیں، ان میں رومان ہے مظاہرِ فطرت کی عکاسی ہے، دکھ ہیں، زندگی ہے، موت ہے، تنہائی ہے، جدائی ہے، معاشرتی وسماجی حبس کے خلاف احتجاج ہے اور انکشافِ ذات ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے اپنے اندر بند دروازے کا کھوج لگا لیا ہو اور خود کو تلاش کرنے میں اب اُسے زیادہ مشکلات کا سامنا نہ ہو۔ اسے جہاں انسانوں سے محبت ہے وہیں وہ مظاہرِ فطرت سے بھی محبت کا دم بھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شاعری میں کچنار کا درخت، سمندر کی لہریں، دریا کے دھارے، تیز ہوائیں اور گملے میں اُگے پھول مختلف استعاروں اور علامتوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ جہاں وہ فن میں سپاٹ اور واشگاف اظہار کے بجائے علامتوں اور استعاروں کا قائل ہے وہیں وہ محبت کے اظہار میں بھی علامتوں اور استعاروں کے استعمال کو محبت کا حسن سمجھتا ہے:

سپاٹ محبت
اخبار میں چھپی خبر کی طرح ہوتی ہے
شام کو دکان دار جس میں
سموسے ڈال کر گاہکوں کو دے رہا ہوتا ہے
میں جب بھی
اس سے محبت کا اظہار کرتا ہوں
وہ فل سپیڈ پیڈسٹل چلا کر
برفیلے پانی سے بھرے
ٹب میں لیٹ کر گھنٹوں
نہاتی رہتی ہے

(برفیلے پانی میں تیرتا استعارہ)

موت ایک فطری عمل ہے اس سے کسی کو بھی مفر نہیں ہے۔ ہر وہ چیز جو وجود رکھتی ہے ایک نہ ایک دن فنا ہو جائے گی۔ اس کرہ ارض پر لاکھوں کروڑوں انسان آئے اور وقتِ مقرر پر خاک میں پنہاں ہو گئے۔ کوئی بھی ذی شعور موت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ تخلیق کار جن کے ہاں زندگی کا شعور گہرا اور عمیق ہوتا ہے ان کے ہاں موت بھی اسی شدت سے زیرِ بحث آتی ہے۔ وہ موت کو زندگی کے لیے خطرہ تصور نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ مسرت افزا امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں، مسعود قمر نے بھی سارتر، کامیو اور کافکا کی طرح زندگی اور موت کو یکساں طور پر قبول کیا ہے۔ موت، خود کشی اور قبر کے استعارے ان کی نظموں میں بار بار آتے ہیں۔ زندگی اور موت کا سنگم ان کے ہاں تعمیر اور تخریب کا اتصال بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ تخریب کے ملبے سے

تعمیر کے پیکر کی بنیاد استوار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

میں نے
اپنی موت ہمیشہ
سنبھال کر رکھی ہے
میں احتیاطاً، ہر روز
ہفتہ میں تین چار بار
یا
مہینہ میں چھ سات بار
اپنی موت دیکھتا رہتا ہوں''

(موت چرانے والی عورت)

''

موت
زندگی کے خلاف سازش کرتی رہتی ہے
موت زندگی کا چہرہ
ڈراؤنا بنا کر دکھاتی رہتی ہے
جنھوں نے زندگی کو نہیں دیکھا ہوتا

وہ
موت پر یقین کر لیتے ہیں

(جھیل میں پڑی پازیب)

موت ایک ایسا موضوع ہے جس پر دنیا کے ہر بڑے تخلیق کار نے خامہ فرسائی کی ہے۔ میر و غالب سے لے کر اقبال اور راشد تک اُردو شاعری میں تصورِ موت پر اشعار اور نظمیں موجود ہیں۔ مسعود قمر نے اس سلسلے کو جاری رکھا ہے۔ وہ موت کو زندگی کی تکمیل خیال کرتے ہیں اور خودکشی کو فرد کی آزادی اور اختیار سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں موت کے علاوہ معاشرتی ناانصافی پر بھی نظمیں موجود ہیں جس میں وہ ریاستی اداروں، مذہبی شدت پسندی اور سرمایہ دارانہ اخلاقیات پر طنز کے تیز برساتے نظر آتے ہیں۔ طبقاتی معاشرے میں پیداوار کے ذرائع کے استحصال کے ساتھ ساتھ انسانی جذبوں اور فکر کا استحصال بھی روا رکھا جاتا ہے جس پر ان کا قلم بڑی روانی سے نظمیں تخلیق کرنے کے ہنر سے آشنا ہے۔ ''آئینے میں جنم لیتا آدمی'' ان کا ایسا مجموعہ ہے جس میں متنوع موضوعات پر نظمیں موجود ہیں جس میں موت، قبر، زندگی، سگریٹ، چائے، میز، خواب، آنکھیں، نیند اور کچنار کے درخت کے استعاروں کو خوب صورتی سے متنوع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک
شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

نظمیں

وہ عورت کبھی اکیلے نہیں سوتی

ہم
کبھی بھی اکٹھے نہیں سوتے
ایک بستر پہ
اُس وقت بھی نہیں
جب ہم، ہم بستری کرتے
آنے والے بچے کا نام
ایک ساتھ سوچ رہے ہوتے ہیں

صرف اور صرف پاؤں رکھنے والا مسافر
کبھی منزل پہ پہنچ نہیں پاتا

اُس کے تھیلے میں
سب کچھ ہوتا ہے
سوائے مسافرت کے

مجھے
اُس عورت کے ساتھ سونے کے لیے
اپنی پوروں سے
اُس کی کمر پہ نظم لکھنے کے لیے
اور خوشبو دیتے
اُس کے گھنگھریالے بالوں سے
اُس کی تصویر بنانے کے لیے
اکیلے سونا پڑتا ہے

میں نے اُس عورت کو
کبھی اکیلے سوتا نہیں دیکھا

☆☆☆

راگ الاپتے پودے

بہت عرصہ ہوا
میں نے
ڈاک وصول کرنا چھوڑ دی ہے
سارے لفافے
اندر سے خالی ہوتے ہیں

میں جب ریل کار کے خالی ڈبے میں
اکیلا سفر کر رہا تھا
تو میں ہر سیٹ پہ جا کے
خود سے ملا تھا
میں نے بہت سے مسعود دوست بنائے تھے

جنہیں میں
اسٹیشن پہ اُتارنا بھول گیا
لفافوں کے اندر
سارے الفاظ لایعنی ہوتے ہیں

سب سے خوبصورت راگ
پودے الاپتے ہیں
پودے الاپتے ہیں
دھرپد اور خیال
بغیر الفاظ کے
میں جب سُنتا ہوں
پودے کی ایک شاخ کو دھرپد
اور
دوسری شاخ کو خیال گاتے

تو
لفظوں کا خالی پن

کُھل کر میرے سامنے آ جاتا ہے

جو

ریل کے پہیوں کی گائیکی سمجھ نہ پائے

وہ

تمہارا دوست نہیں بن سکتا

چاہے وہ خالی ڈبے میں

اکیلا

تمہارے ساتھ لمبا سفر کرے

☆☆☆

سگرٹ سُلگانا آسان نہیں

ایک ہی درخت
سارے موسموں کے پھلوں سے لدا ہے
گہرے کھدے ناموں کے جلی حروف
ایک دوسرے میں پیوست
بوس و کنار میں مصروف ہیں
سیلانی عاشق
تنے سے لپٹ لپٹ کر
سیلفیوں پہ سیلفیاں لے رہے ہیں
ایک گلوکارہ
ملکہ ترنم، عالم لوہار، طفیل نیازی
مہدی حسن، ملکہ پکھراج
اور

بسم اللہ خاں کی شہنائی بجائے جا رہی ہے

میز سے لگی
سیلز گرل
نائلون کی جرسی سے
ماؤ کیپ، پینٹ، کانوں تک کو ڈھانپتی ٹوپی
آدھی رانوں تک کو ڈھانپتا سکرٹ

اور

انگیا سے اُمڈتی دکھائی دیتی ہے
لیکن
بے لپک شعلوں سے سگرٹ سُلگانا
کچھ آسان نہیں

☆☆☆

مرحوم کی آخری موت

میں آنکھیں موندے
دیکھتا رہتا ہوں
اُس سڑک کو
جو بنا استعمال ہوئے ہی
ٹوٹ چکی ہے
اور سُنتا ہوں
اُس ہرے پتّے کا سرسراہٹ بھرا گیت
جو جلد ہی خشک ہو کر
خزاں کے تل پر رقص کرے گا
اور
پھر کسی کے پاؤں تلے دب کر چُرمرائے گا

اور

اُس وقت میں اُس کی آخری
ہچکی بھی سُن نہ پاؤں گا
کہ
میں تو ہمیشہ سے مگن رہا
اُس سیاہ کوٹ میں
جس کے کندھوں پہ پڑے
بال گیت گاتے ہیں
تو
میری شریانوں میں مور ناچتے ہیں
میں پانی دیتا رہتا ہوں
اُس پودے کو
جو۔ر پکڑنے سے پہلے ہی
گل چُکا ہے
اور اب میں
ڈھونڈ رہا ہوں ''اُسے''

جس کے ساتھ چہل قدمی کر سکوں

اس سڑک پر
دھوپ میں جس کا تارکول پگھل چُکا ہے
میں کہوں گا ایک پاؤں سے
ذرا اُدھر سے ہو کر گزر جائیں
یہاں ایک خزاں گزیدہ خواب پڑا ہے
اور پھر
سیاہ کوٹ کے کندھوں پہ
بہتے ہوئے گیت
خود پہ اُنڈیلتا رہوں گا
اُنڈیلتا رہوں گا، اُنڈیلتا رہوں گا
اور گل کر اُتر جاؤں گا
خوش آمدید کہتی
دھرتی کی آغوش میں

☆☆☆

نوٹ! اس نظم کا عنوان میں نے میرپور خاص سندھ کے شاعر اور ناول نگار قاسم رحمان کے ایک ناول سے لیا ہے۔

بغیر آواز برستی بارش

آواز بھری بارش کو
اب تو
کتابوں میں بھی
برسنے کی اجازت نہیں ہے
باہر.....ربِ موسم نے
کرفیو نافذ کر رکھا ہے
درختوں کی زبانیں
کاٹ دی گئی ہیں
مُبادا وہ فضا میں
کوئی گیت بکھیر دیں
حکم عدولی کرنے والے
درختوں کی لکڑی
صرف مُردے جلانے کے کام آئے گی

ندی

اپنی روانی جاری رکھ سکتی ہے

مگر

اپنا ٹھنڈا.....اور میٹھا پانی

اپنی آخری تہہ میں رکھے

وگرنہ

اس کا رنگ سُرخ ہونے میں دیر نہیں لگے گی

ہر چوک میں آر ڈی نینس

بے سُرے راگوں میں

گائے جا رہے ہیں

ایسے میں، دلہنوں نے فیصلہ کیا ہے کہ

وہ اپنی نسل کو

بدصورت ہونے سے بچانے کے لیے

حکومتی دائیوں کا ہاتھ

اپنے پیٹ پہ لگنے نہیں دیں گی

اور شاعروں نے
ٹکٹکی پہ باسی روٹی کھاتے
پشت سے نکلتے لہو سے
لفظوں کو محفوظ کر لیا ہے

ایک گیت لایعنی موت کے لیے

میں
بہت عرصے سے پریشان رہتا ہوں
شیو کرتے وقت
محترمہ کے اور اپنے
کپڑے استری کرتے وقت
دُھلے برتنوں کو
الماریوں میں رکھتے وقت
گملوں کی مٹی بدلتے وقت
اور
شام سات بجے سے پہلے
دن کی آخری چائے پیتے وقت
پریشان رہتا ہوں

کیا..... مجھے مرنے سے پہلے
اداسی کا گیت سُننا چاہیے
یا
خوشی کا گیت سُننا چاہیے
برفانی ریچھ
میدانی علاقوں میں آ کر بھی
برف ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے
وہ سمجھتا ہے، برف کے بغیر
وہ زندگی سے خالی
موت کے ساتھ پھر رہا ہے
اداسی کا گیت
میرے مرنے کے بعد بھی گایا جا سکتا ہے
خوشی کا گیت
میرے مرنے کے بعد بھی گایا جا سکتا ہے

لیکن میری موت اگر
زندگی بھرے کسی بھی

ایک گیت سے محروم رہی

تو

وہ ایک لایعنی موت ہوگی

☆☆☆

ایش ٹرے صاف کرتے رہنا ایک بیماری ہے

(اپنی دوست کنول ابراہم کے نام)

بہت عرصہ ہوا
میں نے سگرٹ پینا بند کر دیا ہے
مگر
میں خود کو ایش ٹرے سے
اُٹھانا بھول گیا
ہر صبح میں
گلاس اور ایش ٹرے
مانجھ مانجھ کے صاف کرتا ہوں
مگر ہر شام
گلاس میرے اندر
اور میں ایش ٹرے میں ہوتا ہوں

کمرا دھوئیں سے بھر جاتا ہے
لیکن، میرا دم نہیں گھٹتا
میں آرام سے کافکا
پڑھتا رہتا ہوں
مجھے
نیند میں چلنے کی عادت نہیں
میں
چلتے چلتے سو جاتا ہوں
اور.....اُس وقت جاگتا ہوں
جب سایہ کہتا ہے
اب کدھر مُڑنا ہے؟
ایش ٹرے صاف کرتے رہنا ایک بیماری ہے
نیند میں چلنا کوئی بیماری نہیں
کیا کافکا کے بغیر
میں ننگا نظر آؤں گا

☆☆☆

بے حمل پیدائش

(زاہد ڈار کے نام)

مصروفیت کی بنا پر
بہت عرصے سے
میں مر نہیں سکا
مجھے ماں کے پیٹ سے
وقت سے پہلے مردہ نکالا گیا
مگر غربت کی وجہ سے دفنایا نہیں گیا
بہت عرصے سے
میں زندگی کے بغیر
زندہ رہے جا رہا ہوں
اور
مردہ ادب لکھ، لکھ کر

مردہ ادبی ایوارڈ حاصل کیے جا رہا ہوں
میری پیدائش کے لیے
کسی عورت کا حاملہ ہونا ضروری نہیں
میری پیدائش ایک خواب کی منتظر ہے
جس میں
وہ عورت اور میں
برف باری میں
اک دوجے کی نظم پڑھتے
اک دوجے کو تاپ رہے ہوں

☆☆☆

لاٹری میں نکلی قبر

(ہما شاہ کے نام)

میں
اکیلا بڑی محنت سے
قبر کھودتا، کھودتا تھک جاتا ہوں
قبر مکمل ہوتے ہی
گھر جا کے جلدی سے
جسم کے ساتھ چمٹی
مٹّی اُتارنے کے لیے
خوشبودار صابن سے نہا کر
رامیز پرفیوم چھڑک کے
کپڑے پہن کر، بس ابھی مرنے کی
تیاری ہی کر رہا ہوتا ہوں

کہ
کسی اور کے مرنے کا اعلان ہو جاتا ہے
اور.....
اور میری کھدی ہوئی قبر میں
اُس مرنے والے کو دفنا دیا جاتا ہے
میرے ساتھ اس مہینے، یہ دسویں بار ہو چُکا ہے

میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے
بغیر دفن ہوئے، مرا ہوا
دفتر جایا کروں گا
مردہ جسم سے محنت کر کے، مردہ لوگوں کی سفارش سے
دفتر کی اونچی کرسی پہ بیٹھوں گا
ہر شام اُس عورت کے ساتھ مل کر
اپنی فوتیدگی پہ جمع احباب کا
سرخ وائین کے جام کے ساتھ استقبال کیا کروں گا
ہفتہ کی شام کو گھر آتے ہوئے
اسکینڈلوں سے بھرا شام کا اخبار

بیف کا ایک ٹکڑا

اور

کونیاک کی آدھی بوتل خریدا کروں گا

شوکیسوں میں رکھیں، بعض ڈمیاں

لباس فروخت کرنے میں

بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں

لاٹری میں اگر

میرے نام کی کوئی قبر نکل آئی

تو میں لاٹری میں نکلی قبر میں

دفن ہونے کے لیے

ڈمی پہ پہنائے دولہا کے جوڑے کو پہن کر

تابوت میں لیٹنے کے لیے

سرپٹ بھاگتے گھوڑے پر بیٹھ کر

قبرستان جاؤں گا

مبادا لاٹری میں نکلی میری قبر میں

کوئی اور دفنا دیا جائے

میں نے

پہلے دن جو قبر کھودی تھی

تو

مجھے مرے ہوئے

ایک سو بیس سال ہو گئے تھے

عمل زمین پہ تھا قہقہے آسمان پہ تھے

آج ہی کے دن *

جب اس کا بدبو سے بھرا بدن پھٹا تھا

پھلوں کے فیسٹیول میں

سہاگنوں نے آموں کے ہار

گلے میں ڈالے، ننگے پاؤں

کھلے بالوں کے ساتھ رقص کیا تھا

آج ہی کے دن

نیک دل لڑکیوں نے

گیارہ سال سے اپنی بنجر محبت میں

اپنے بوسوں کا بیج بویا تھا

چوکوں میں لگی ٹکٹکیوں پہ جمے خون نے

دیمک بن کر

ٹکٹکیوں کو کھانا شروع کیا تھا
آسمان سے قہقہوں کی بارش ہوئی تھی
مگر
باریش پیٹوں اور گول ٹوپیوں نے
اس بدبو کا اپنے پیٹوں اور ٹوپیوں میں
ذخیرہ کر لیا تھا
اور اب یہ بدبو
عدالتوں میں سفید وگ پہنے
اسکولوں میں درسی کتابیں پکڑے
اور
ایوانوں میں آئینی صفحے پھاڑتے
سینکڑوں بدبودار بدن بنانے میں جُتی ہوئی ہیں

☆☆☆

*17 اگست 1988ء

سمندر کا قہقہہ

میں
خشک سمندر میں
اکلوتے چپو سے
مضبوط کشتی کھیتے، کھیتے تھک کر
مچھلیوں کی محبت میں تیرنے لگا
تو
میری آنکھوں نے
خشک سمندر کو پانی سے بھر دیا
اور جب
سمندر کو اپنی بانہوں میں
لینے کے لیے میں نے
اکلوتا چپو سمندر میں گرایا
تو
سمندر قہقہہ بن گیا

مرے ہوئے انسان کا خودکشی کرنا

(عاصم جی حسین کے نام)

عاصم حسین کہتا ہے
''مرے ہوئے انسان کا خودکشی کرنا
آسان نہیں ہوتا
میں نے درختوں کو
خودکشی کرتے دیکھا ہے
جو بغیر قبر کے
سڑک کنارے پڑے رہتے ہیں
ہر مرے ہوئے انسان میں
چند حروف ادا ہونے کے لیے
بے تاب رہتے ہیں
جو

کبھی کبھار نہلانے والے

یا

اسے پہلا اور آخری

بوسہ دینے والے کو سنائی دیتے ہیں

لفظوں سے خالی موت

کسی کسی کو آتی ہے

امتحانی کمرے سے اُٹھا کر

سیج پر بٹھائی گئی لڑکی

خودکشی

اپنے ساتھ لاتی ہے

شہر مرے ہوئے لوگوں سے

بھرے پڑے ہیں

مرے ہوئے لوگوں کو

اپنی تدفین کے لیے

خودکشیاں کرنی پڑتی ہیں

☆☆☆

نابینا سے اُدھار لیا گیا خواب

میں نے
پب میں بیٹھے
دسویں بیئر پیتے ہوئے
نابینا کو چھ دن کے لیے
اپنی آنکھیں دان کر دیں
نابینا
آنکھیں پانے کی خوشی میں
اپنے خواب وہیں بھول گیا
خواب میں لوگ
ایک دوسرے سے محبت کر رہے تھے
میں
خوابیدہ لوگوں کی

محبت حاصل کرنے کے لیے

انہیں اپنے اوپر لگے

ٹھٹھے سنا تا رہا

انہیں اپنے اوپر پھینکی گئی

گندگی دکھا تا رہا

سوئے ہوئے لوگ

جو

ٹھٹھے اور گندگی سے نا آشنا تھے

اب ایک دوسرے پہ

ٹھٹھے لگا رہے ہیں

ایک دوسرے پہ

گندگی پھینک رہے ہیں

میں سوچتا ہوں

لوگوں کا ایک دوسرے پہ

ٹھٹھا لگانا

ایک دوسرے

پہ گندگی پھینکنا

کیا میرے آنکھوں کے بغیر
دیکھے گئے خواب کی سزا ہے

نابینا
میری آنکھوں سمیت
کسی خفیہ جگہ پہ
نیندوں میں خواب جمع کر رہا ہے
تا کہ
وہ کسی اور سے، چھ دن کے لیے
آنکھیں اُدھار لے سکے

ابروؤں کی بالائی پگڈنڈی
نابینائی کے کرب سے لبریز
گھاؤ کا آخری کنارہ ہے
کسمسا کر اُمڈتے خواب
میرے رخسار سے ہوتے ہوئے
میری گردن اور کالر کے درمیان

چپک رہے ہیں
کاش
کوئی ایک گھنٹہ کے لیے
اپنی آنکھیں مجھے دان کر دے
تا کہ میں . .
کالر اور گردن کے ساتھ چپکی
پپڑی کھرچ کھرچ کر اُتار سکوں

☆☆☆

نوٹ!

یہ نظم میں نے فیودر دستوفسکی کے افسانے 'ایک مضحک آدمی کا خواب'' سے متاثر ہو کر لکھی ہے

وہ ، میں اور درخت

لہلہاتے درخت نے جب مجھے
نظم سمیت جنم دیا
تو
''وہ'' اپنی یکتائی کھو بیٹھا
آسمان غبار کے سوا
کچھ نہ رہا
پیڑ
مجھے نظم سمیت جنم دے کر
بانجھ تو ہوا
مگر ہرا بھرا رہا
'وہ' اب آسمان سمیت
''ہمہ اوست'' میں پناہ لے چکا ہے

شاعر سے زیادہ

کون جانتا ہے کہ آسمان

کس سراب میں گُم ہے

یکتائی کا بھرم ٹوٹتے ہی

''وہ'' تو خود زمین کی کوکھ میں

اُتر کر بانجھ ہو چُکا ہے

اور

سوا نیزے پہ آئے ہوئے

آسمان پر

میں ایک نظم بن کر طلوع ہو چکا ہوں

درخت، میں اور نظم

اپنے جنم دن کی خوشی میں

منعقدہ ضیافت میں

کھانے کے کورس کا

بارہواں قہقہہ لگا رہے ہیں

اور ''وہ''

آسمان سمیت میری دہلیز پر

منفی ساٹھ میں ٹھٹھر رہا ہے

ایک نشہ باز کرسی

میں نے
اس کرسی پہ بیٹھ کر
جتنی محبتیں کی ہیں
اس کرسی کے بغیر
کبھی اتنی محبتیں نہیں کیں
میرے سارے وصل
میرے سارے ہجر
اسی کرسی نے بسر کیے ہیں
مگر.....مگر اب یہ کرسی
ایک نشہ باز کرسی ہوگئی ہے
جو ہر وقت مجھ سے
رگ و پے میں اتارنے کے لیے
کوئی نہ کوئی ہجر، کوئی نہ کوئی وصل مانگتی رہتی ہے

لیکن

میرے تو سارے وصل خوابی

اور

سارے ہجر عذابی تھے

اور مجھ پہ طلوع ہوتے

بے تعبیر خواب بھی تو

غروب ہوتے منظروں کی

تماثیل محض تھے

بے افق طلوع ہوتے سورجوں کا

معکوس سفر نامہ

میں نے اسی کرسی پہ بیٹھ کر

ڈوبتی شاموں کے سرمئی بدن پر

تحریر کیا تھا

مجھ پہ خوابوں کی چوری کا

الزام لگانے والے جانتے ہیں

کہ سزا کے طور پر

مجھے کئی کئی راتیں

جگائے رکھا جاتا تھا

سورہائی کے بعد
کھولی کی صفائی کرتے وقت
خاکروب کو میرے سب خواب
اسی دیوار سے لٹکے ملے تھے
جو میرے رت جگوں نے
خشتِ حرف سے تعمیر کی تھیں
روشنائی میں گُندھے یہ خواب
تو میں اب بھی دیکھتا ہوں
میں اب بھی وصل اور ہجر کے
شش جہت پھیلتے نشوں سے
مالا مال ہوں
لیکن
کاٹھ کی اس نشہ باز کرسی کا
نشہ پورا کرنے سے قاصر ہوں
کہ میں خود
آدم خور ریشوں میں اُتر کر
مفلس النشہ ہو چکا ہوں

زادِ راہ

ہر انسان کو
ایک بنی بنائی قبر
ایک مختصر سا سمندر
اور
ایک پھول ہر وقت
اپنے ساتھ رکھنا چاہیے

ڈانگری پہنے، پسینے کو
مشین کی میل کے ساتھ کھاتے
جب تم چیختے ہوئے
سوزانا کو چھ نمبر کے پیچ کس کا کہو
اور

سوزانار خسار سے کھیلتی لٹ کو
چھ نمبر کے پیچ کس سے پیچھے ہٹاتی
پیچ کس تمہیں پکڑائے
تو.....تم پیچ کس واپس کرتے
اُسے پھول دے سکتے ہو
نیند کے صحرا میں چلتے چلتے
چھالے جب تمہارے پاؤں پر
کشیدہ کاری کر لیں
ایسے میں
اچانک کہیں اگر کشتی نظر آئے
تو
پاس کا سمندر، تمہاری مدد کر سکتا ہے

ہر بار کی طرح
آخری وقت میں، جب تم بھاگتے، بھاگتے
بغیر ٹکٹ کے ٹرین پکڑو
سیٹ پہ بیٹھ کر

پانچویں سٹاپ کے آنے سے پہلے
سگریٹ کی ڈبیا

اور

کافکا کھولو

ایسے میں، اگر ٹکٹ چیکر کی
ٹکٹوں میں سوراخ کرنے کی آواز
تمہیں سنائی دے

تو.....تم
کھلی ڈبیا، کافکا کی کھلی کتاب

اور

بنی بنائی قبر کو ساتھ لیے
چلتی ٹرین کی کھڑکی سے
چھلانگ لگا سکتے ہو

☆☆☆

اُدھورے کاموں والی مکمل عورت

(رفعت ناہید کے نام)

تم
کام کرتی رہتی ہو
کم روشنی میں بھی
سورج کی تیز تپش میں بھی
کام.....کام.....اُدھورے کام
جو تم کبھی مکمل نہیں کر پاتی

تم اپنے شفاف اور خوبصورت پیروں کو
ہمیشہ
پھٹے، بدبودار اور گندے موزوں سے
بچائے رکھتی تھی
اور اب
بے کار سے کاموں کی تھکن سے

پہن لیا تم نے
آدھے جسم کو ڈھانپتا ایپرن
مگر تم تو
پورے جسم کی عورت ہو
میں دیکھتا رہتا ہوں ہر وقت تمہیں
بچوں کے گندے موزے دھوتے
اُن کے لیے چپس بناتے، اُن کی لُڈو سنبھالتے
بچوں کے لیے گول گپوں کی کھٹائی بناتے
اور
استری گرم ہونے تک
نظم لکھتے
سورج
کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا
یہ تمھارا سایہ ہے
جو تم سے چُھپنے کے لیے
سورج کے آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے

میں

جب سورج کی تیز تر

تپش میں تمہیں کام کرتے، تمہاری پیشانی پہ

پسینے کی نمی دیکھتا ہوں

تو

پیشانی پہ بوسہ دینے کے لیے

تمہاری طرف آتے آتے رُک جاتا ہوں

مبادا

تم میرے بوسے کی نمی کو، پسینے کی نمی ہی نا سمجھ لو

بس اتنا کہتا ہوں

''جان اب بس بھی کرو، تھکن دیکھو

افشاں جبیں پہ اُتر آئی ہے''

اور.....اور تم، لٹ کو پیچھے کرتے

سارے پسینے کی نمی

میری چھاتی پہ اُتارتے کہتی ہو

''اب کہاں ہے تھکن؟''

☆☆☆

ایک کمرا نظم کے لیے

میں نظم لکھ کر
گلاسوں، چائے کے کپوں میں رکھ دیتا ہوں
میری پسندیدہ نظمیں
ووڈکا، سُرخ وائین، برانڈی یا وہسکی
کے گلاسوں میں پڑی ہوتی ہیں
مختصر نظم کیپوچینو والے کافی کے کپ میں پڑی ہوتی ہے
اور.....
اور پھر ایک دن
کوئی کپ، کوئی گلاس
ساری کی ساری، میری نظمیں پی جاتے ہیں
نظم کا کوئی ایک حرف تک

دُردِ تہِ جام تک نظر نہیں آتا

میں سوچتا ہوں

نظموں کے لیے ایک کمرا بنالوں

ایک بک شیلف میں

* الیگزنڈر پشکن کی طویل نظمیں

بنجارے، تانبے کا شہ سوار اور شامِ زندگی رکھوں

دوسرے بک شیلف میں

** ایرش فریڈ کی طویل نظمیں

سوالات، محبت اور موت رکھوں

ایک خانے میں مصر کی قدیم اور مختصر نظم

جو زندگی سے اُکتا گیا نظم رکھوں

*** آرنسٹ جوزف کی نظم

جو اُس نے خودکشی سے پہلے

زندہ لوگوں کے نام لکھی وہ رکھوں

****انیلا جوزف کی طویل نظم

میں چمکیلے پتھروں پہ بیٹھا، وہ رکھوں

ایک پوری کی پوری بک شیلف کے سارے خانوں میں

*****لورکا کی گائی ان گائی نظمیں رکھوں
چے گویرا کی، فیڈرل کاسترو پہ لکھی گئی نظم رکھوں
مارٹن لوتھر کنگ کی نظم ''میں اکیلا لڑوں گا'' رکھوں
شکیب جلالی اور سارا شگفتہ کو
ریلوے لائین سمیت رکھوں
امرتا پریتم کے سارے تراجم
جو اُس نے
خودکشی کرنے والے شاعروں کی شاعری کے کیے،
ان سب کو رکھوں
فطرت سوہان کی نظمیں
کچکچاتی ریت کا ذائقہ، جھلمل لمحے، کائی جمی پیالی رکھوں
شاہ حُسین، بُلھے شاہ کی شاعری اور ان کے
ان پڑھے جنازے رکھوں
میں
کمرے میں پڑے گلاسوں، چائے کے کپوں کو
اپنی نظموں سمیت
بک شیلف کے سارے خانوں میں بھر دوں

مگر.....

مگر میرا اندر تو تجاوزات سے بھرا پڑا ہے

میں کمرا کہاں بناؤں؟

☆☆☆

* الیگزنڈر پشکن روسی شاعر

** ایرش فریڈ جرمن شاعر

*** ارنسٹ ٹولر جرمن شاعر

**** اتیلا جوزف ہنگرین شاعر

*****لورکا اسپینش شاعر

پانی سے خالی سمندر

وہ نظم لیے
کشتی میں آ کے کیا بیٹھ گئی
دنیا نے خود کو
چپو بنا لیا
وہ
سوتی نظم سے اچانک جاگتی ہے
اور کہتی ہے
''بھیا زور سے''
اور دنیا اُس کی نظم کے
زیر، زبر، پیش، کو مہ بننے کے لیے
اپنی ساری طاقت
چپوؤں میں منتقل کر دیتی ہے

سمندر کے پانی نے
خود کو پوٹلی میں باندھا
خود کو کندھے پہ رکھا
اور کنارے پہ آ کے بیٹھ گیا
اور دنیا
چپو بنے اُس کی
کشتی کھینے میں جُتی ہوئی ہے

☆☆☆

خدشوں کی کاک ٹیل

کل شام کافی پیتے
بس یونہی خیال آیا
یہ کافی
اُس کے ساتھ بھی تو پی جا سکتی تھی
پچھلے دنوں
پب میں تیسرا ووڈکا پیتے بھی میں نے یہ سوچا تھا
مگر
گاڈ فادر فلم دیکھتے، میں نے ایسا نہیں سوچا تھا
اُس وقت وہ میرے ساتھ تھی
مگر، یہ بہت پہلے کی بات ہے
جب ہم پارک میں بیٹھے، ایک دوسرے سے بہت بور ہو گئے تھے
تو ہم نے

ایک دوسرے سے کچھ دیر کے لیے

جُدا ہونے کے لیے

اکٹھے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا

پتا نہیں دونوں میں سے کس نے

محبت کا اظہار کیا

پتا نہیں دونوں میں سے کس نے کہا

''اوکم آن یار

ہم پہلے ہی ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرنے لگے ہیں''

ویسے تو اُسے دیکھے، بہت عرصہ ہو گیا ہے

مگر، اب ہم خیال میں بھی

ایک دوسرے سے

محبت میں کثرت کی بات نہیں کرتے

مبادا

ایک دوسرے سے کچھ دیر

جُدا ہونے کے لیے

ہمیں

اکٹھے فلم نہ دیکھنی پڑے

معلّق ہوئی کھسیانی ہنسی

اس سے پہلے
کہ پھول باسی ہو جائیں

وہ
مجھے مرا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں

وہ میری میت پہ
مرے ہوئے پھول نہیں رکھنا چاہتے
مگر مجھ پر
مرے ہوئے نوحے لکھ لکھ کر
مجھ سے جُڑے رشتے پہ تھوکتے
لعنت بھیجتے

گُرلاتی آواز میں بین کرنا چاہتے ہیں
میری ٹکٹکی پہ بندھی زندگی
ان کہی آہنی ضربوں سے
ہمیشہ خونچکاں رہی ہے
لیکن میں نے کبھی
بڑھ کر دروازہ نہیں کھولا
مگر اب
ٹوٹی دیوار میرے کمرے تک آ گئی ہے
تماش بین پونوں میں روٹیاں باندھے
مجھے سنگسار ہوتا دیکھنے کے لیے
جوق دَر جوق آ رہے ہیں
''پانی کے چند گھونٹ مل سکتے ہیں''
میں نے، قلم نما خنجر پکڑے قاتل سے پوچھا
''ابھی کچھ دیر انتظار کرو
مرنے سے پہلے تمہاری ہر خواہش پوری کر دی جائے گی''
قاتل نے قلم نما خنجر سے، قصیدہ لکھتے ہوئے کہا
''تم مجھے کب مارنا شروع کرو گے''

''آغاز ہو چکا ہے، مکمل بھی ماردیں گے
مجھے قصیدہ مکمل کرنے دو
اور، ایک بات تو بتاؤ
تم کالی سیاہ زمین کی کوکھ سے پیدا ہو کر
روشن نظمیں کیسے لکھ لیتے ہو
اور، یہ بھی بتادو تم کیسے مرنا چاہتے ہو''
قاتل نے قلم نما خنجر ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا
''میرے اندر
سمندر کی آخری تہہ کی مچھلیاں ہیں
جن کی آنکھیں نہیں ہوتیں
مگر جو تمہارے، اس خنجر کی دھار سے زیادہ
روشن ہوتی ہیں
اور
میں بہت آہستہ آہستہ مرنا چاہتا ہوں
تاکہ تم کو "ہمبا" سکوں
میرا جواب سُن کر
روٹی سے خالی پونے پکڑے تماش بین

زوردار قہقہے لگانے لگے
مگر
قاتل کے قلم نما نوک دار خنجر پہ
کھسیانی ہنسی معلق ہو کر رہ گئی

☆☆☆

نوٹ!

محمود درویش کی نظم They want to see me dead. اور فطرت سوہان کی نظم ''آخری نظم'' سے ماخوذ

برف میں دبے زرد پتّوں کی چُرمراہٹ

محبت
خود کو مکمل طور پہ
اُن کے سامنے کبھی نہیں کھولتی
جو چہرے پہ لگی دو آنکھوں سے
محبت کو کُھلتا دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں

میں
لوگوں کی بنائی محبت
کب تک قبول کرتا رہوں
میں
ایک محبت اپنی بنانا چاہتا ہوں

ہر درخت کے اندر

ایک درخت ہوتا ہے
وہ اُس وقت نظر آتا ہے
جب تم
خود درخت بن جاؤ

برف پہ تمہارے چلنے کی
اور
برف کے نیچے دبے
زرد پتّوں کی چُرمراہٹ کی آواز
ہمیں ہماری اپنی محبت
بنانے میں مدد کر سکتی ہے

☆☆☆

نوٹ!

فلاسفر فلابیر نے ایک دن افسانہ نگار موپساں کو ایک درخت کے سامنے کھڑا کیا، اور موپساں کو دو گھنٹے کا وقت دیا کہ موپساں درخت کے بارے بتائے۔ فلابیر کی رائے ہے کسی بھی شے کا کوئی نہ کوئی پہلو آنکھ سے اوجھل رہتا ہے، کیونکہ ہم چیزوں کو دوسروں کی کہی ہوئی باتوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ نظم فلابیر کے اسی فلسفے سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔

جلوس سے بھاگے ہوئے لوگ

میں
کسی سے طبعی محبت نہیں کرتا
طبعی محبت کرنا ایسے ہے
جیسے
بلا تامّل جیتے جانا
اس سے بہتر ہے
دیر تک
آسمان کو دیکھا جائے
آسمان کو دیر تک دیکھنے سے
وہ خوب صورت تنہائی ملتی ہے
جو قبر میں بھی نہیں مل سکتی

خودکشی

خودمختاری کی انتہا ہے

خودمختاری

اُس خلا کو پُر کرتی ہے

جو بغیر محبت کے

ہم بستری کرنے سے پیدا ہوتا ہے

لوگ طبعی محبت کے

اتنے عادی ہو جاتے ہیں

کہ جلوس سے

پانی پینے کے بہانے بھاگ کر

گھر میں پڑے بستر پہ لیٹ کے

طبعی موت مر جاتے ہیں

☆☆☆

فیس بک کی سڑک پہ پڑا جنازہ

کالا گھوڑا

میری محبت ہے

مگر

ابھی میری نظمیں

ادھوری ہیں

ابھی میری محبتیں

کہیں اور مصروف ہیں

ابھی میں نے ایوا کا دیا ہوا

سیب پورا نہیں کھایا

لوگ جنازوں کو اُس وقت تک

دفنانے نہیں دیتے

حب تک وہ

پچھلے جنازوں کا بقایا

اور

مستقبل کے جنازوں کا بیعانہ

وصول نہیں کر لیتے

جنازے فیس بک کی سڑک پہ پڑے

اپنی بولیاں لگتے

اور مناجاتیں سُنتے رہتے ہیں

کچھ عرصہ پہلے

فیس بک پہ پڑے ایک جنازے کی بولی

سب سے زیادہ دو دین داروں نے

میرا نام لیتے

یہ کہتے ہوئے لگائی

اللہ اسے ہدایت دے

میں نے کبھی بھی

فروخت شدہ لاشوں کی تدفین میں، شرکت نہیں کی

کالے گھوڑے

تو میری محبت ہے

مگر.....مگر میں پھٹی بنیان

غیر پالش، بغیر تسموں کے پہنے بوٹ

اور

فروخت شدہ لاش بنے

تابوت میں لیٹا

تجھ پہ سوار نہیں ہوں گا

کالے گھوڑے

میرا تجھ سے وعدہ ہے ایک دن

ہاتھ میں ہوانا کا سگار سُلگاتے

شیواز کو آفٹر شیو لوشن کے طور پہ استعمال کر کے

صائمہ کا دیا ہوا

سُرخ اسکارف پہنے

اپنی نظموں اور محبتوں کی شال اوڑے

اور

ایوا کا دیا ہوا پورا سیب کھاتے

تجھ پہ سوار ہوں گا

اور ہم

منجمد محبتوں والی برف کے

پگھلتے پانیوں میں تیریں گے

اور

لوگ فیس بک کی سڑک پہ پڑے

جنازوں کی رقم

وصول کر رہے ہوں گے

☆☆☆

آسمان بنتی نظم

میں نے
اُڑنے سے پہلے
مرغے کو چھت سے اُڑایا
لیکن وہ مرغِ بادنما بن کر
اپنے محور پہ ساکت ہونے سے پہلے
دیر تک گھمر گھمر کا راگ الاپتا رہا
سو میں نے بھی
ساری عمر کے لیے
اُڑنے کا ارادہ ترک کر دیا

بہت عرصہ
میں صحرا کی طرح ساکن رہا
محلے کی بند سیور یج والی گلی سے
گونجتی شہنائی میں

جب کوئی رخصت ہو رہا تھا

تو

میں استری کرتے

اپنا بیسواں اسکارف

جلا چکا تھا

میں جب بھی

اُس کے لیے نظم لکھتا ہوں

خود کو آسمان میں

لیٹا ہوا محسوس کرتا ہوں

زمین، درخت، پہاڑ

کھلے نیلگوں میں

میرے ساتھ تیرتے ہیں

اگر اُس دن، چھت سے مُرغا اُڑ جاتا

تو کیا میں، اُس کے لیے نظم لکھ پاتا

کیا ہم

آسمان بن پاتے

☆☆☆

بستروں پر پڑی ادھوری نیند

میں نے
کبھی سوچا نہ تھا
بچپن میں تمہیں میں
جس نام سے پکارتا تھا
بڑی ہو کر تم وہی بن جاؤ گی
تم میں اب بچپنا ہے
یا
اُس وقت بڑھاپا تھا
اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے
مجھے اپنی نس نس سے
تجھے نچوڑنا ہے

تا کہ
تم میرے گلاس میں تیرتی
برف کی ڈلی بن جاؤ

اور میں
ٹھنڈے شیشے کی
بیرونی دیوار سے لپٹے
ہر قطرے میں ماضی، حال
اور مستقبل کو ایک ہوتا دیکھ سکوں
تمہیں تو علم ہے
میں نے
کبھی بھی ایک بستر پر
کوئی نیند پوری نہیں کی
بستر پہ سویا تو کرسی پر سے اُٹھا
کرسی پہ سویا
ریلوے کے پلیٹ فارم کے بینچ پر سے اُٹھا

نیند میں چلنے کی عادت
مجھے اُس عورت نے ڈالی
جواب بھی
خود کو بہت سارے کپڑوں میں
گٹھڑی کی طرح
باندھ کے سوتی ہے
مبادا
کوئی اُس کے خواب ہی دیکھ نہ لے
حالانکہ اُس کا ایک خواب تو
اُس کے دوپٹے کے پلو سے لٹک رہا ہے

اور ہاں سنو!
میں بچپن میں
تمہیں کس نام سے پکارتا تھا؟

☆☆☆

چیخ کاوز ٹینگ کارڈ

(باسط میر کے نام)

وہ

اکٹھے ہوتے تھے

شہر کے مخصوص بغیر دروازوں والے

چائے خانوں میں

اور

ان میں لگے پنکھوں کے زوں زوں

کرتے پروں کو گننے کی کوشش کرتے

تو

بیس تیس کا کبھی نہ ختم ہونے والا جھگڑا

اپنے پنکھ پھیلاتا

مُڑے تُڑے صفحات کے دونوں طرف

لکھا جانے والا یہ تجرید بھرا افسانہ

اب تک بے انت ہے

وجودیت، لایعنیت، جدید نظم

مذہب بطور افیون ردِ انقلاب سے بچاؤ

اور

سرمائے کے ایک تجوری میں

اکٹھے ہونے کے اسباب پر

بحث کرتے، کرتے

تمباکو کی تیز کڑواہٹ

اور

چائے کا کسیلا پن بڑھتا

تو

ان میں سے کچھ غائب ہو جاتے

اور.....اور ملنے لگتے

شہر کے کسی تہہ خانے میں

جہاں وہ چھپا دیتے اپنے جوتے

بغیر کسیلی چائے اور تمباکو کی کڑواہٹ کی

کھسر پھسر پہ گزارا کرتے

اور.....

اور پھر ان میں سے

کچھ غائب کر دیے جاتے

جو بالآخر پہچانتے ایک دوسرے کو

ساتھ والی بیرک سے

چیختی آخری چیخ سُن کر

بیرک سے نکلتے خون میں سونگ لیتے

کسیلی چائے کا ذائقہ اور تیز تمباکو کی بو

یہ بہت بہت بہت

برسوں پہلے کی بات ہے

اب

کافی ہاؤسوں میں

ائیر کنڈیشنر کی وجہ سے

کافی ہاؤسوں کے

بند دروازے بند ہی رہتے ہیں

اور

اعلیٰ قسم کے سگار کا دھواں

بیٹھے لوگوں کے سروں پہ

سایہ کیے رکھتا ہے

شہر کے سارے تہہ خانے

جعلی شراب بنانے

اور

نمازیوں کے لیے سفید گول ٹوپیاں بنانے کی

فیکٹریوں میں تبدیل ہو گئے ہیں

شہر کی ساری بیرکیں

ایوانِ اقتدار میں

شفٹ کر دی گئی ہیں

☆☆☆

موت چُرانے والی عورت

میں نے
اپنی موت ہمیشہ
سنبھال کر رکھی ہے
میں احتیاطاً، ہر روز
ہفتہ میں تین چار بار
یا
مہینہ میں چھ سات بار
اپنی موت دیکھتا رہتا ہوں
میں
اپنی موت کی جگہ بھی بدلتا رہتا ہوں
کبھی گلدان کے نیچے، کبھی غلاف میں لپیٹ کر طاق میں
کبھی پرانے خطوں والے

ڈبوں میں سے ایک ڈبے میں چھپا دیتا ہوں

اور

کبھی کانٹوں بھری بیری کی

سب سے اوپر والی شاخ پہ

لٹکا دیتا ہوں

مگر میں نے

موت کو کبھی بھی

گھر کے کباڑ خانے میں نہیں رکھا

میں بے تحاشا سگریٹ پیتا ہوں

وہ عورت بھی

بے تحاشا سگریٹ پیتی ہے

مگر اُس عورت نے کبھی میری سگریٹ نہیں چُرائی

میں ہر رات سرخ وائن کی

ایک دو بوتلیں پی جاتا ہوں

وہ عورت

مجھ سے بھی زیادہ

سرخ وائن پیتی ہے

مگر
اُس عورت نے کبھی بھی
میری وائن نہیں چُرائی

کل رات
جب اُس عورت نے
آخری ہچکی لی
تو
میں اپنی موت کی طرف بھاگا
مگر
میری موت اپنی جگہ پہ نہیں تھی
یہ عورت
جس نے کبھی میری سگریٹ
کبھی میری بوتل نہیں چُرائی
کبھی میری کوئی چیز نہیں چُرائی
میری موت چُرا کر لے گئی

☆☆☆

خودکشی کرتا آسمان

مجھے
زندگی سے محبت ہے
مگر
موت سے بھرپور زندگی کو
خودکشی ہی
زندگی دے سکتی ہے
خشک سالی کی بستیوں میں
بسنے والوں نے
آسمان کو خودکشی کرتے دیکھا ہے
مگر
ان بستیوں کے آسمان کی
گردن لمبی نہیں ہوتی
ٹانگیں لمبی ہو جاتی ہیں
اور

آسمان زمین سے

اور زیادہ دور ہو جاتا ہے

میرا وعدہ ہے

اگر

ریاستی تشدد برداشت نہ کر سکا

تو

مُٹھی نہیں کھولوں گا

میں نے ازار بند میں

ایک کیل چھپا کر رکھی ہے

آج ہی صبح ناشتے کی میز پہ

پانچواں ٹوسٹ کھاتے

میں سوچ رہا تھا

میری نظموں میں خودکشی کا ذکر کیوں آتا ہے

شاید! خودکشی کرنا

بدہضمی سے مرنے سے

بہتر عمل ہے

☆☆☆

جھیل میں پڑی پازیب

موت
زندگی کے خلاف سازش کرتی رہتی ہے
موت زندگی کا چہرہ
ڈراؤنا بنا کر دکھاتی رہتی ہے
جنہوں نے زندگی کو نہیں دیکھا ہوتا

وہ
موت پہ یقین کر لیتے ہیں
اور پھر کسی انہونی کے خوف سے
ساری زندگی
موت کو ساتھ، ساتھ لیے پھرتے ہیں
بہت پہلے
میں نے زندگی کو

پازیب سمیت جھیل میں
بلیک کافی کے کپ
سرخ وائن کے گلاس میں

اور

سڑک پہ جمے مزاحمتی
خون میں دیکھ لیا تھا

سو، موت
مجھے آج تک نہیں مار سکی
حالانکہ لوگ مجھے
کئی بار دفنا چکے ہیں

☆☆☆

ایک گیت اُداس کتاب کے لیے

(اپنی دوست رفعت ناہید کے لیے)

اپنے سیکسوفون پہ
تم کبھی بھی گیت گا سکتی ہو

اس ندی پہ
جس کے پانی کے چھینٹے
ہم ایک دوسرے پہ پھینکتے تھے
تم گیت گانا
اُس مسنگ پرسن کے لیے
جس کے منہ، ناک، کانوں

اور
آنکھوں میں ریت بھری گئی

اور
پھر گولی ماردی گئی
جیسے

سپاہی مشق کے دوران
ریت بھری بوریوں میں
اپنی بندوقیں خالی کرتے ہیں
تم
گیت گانا ان چیونٹیوں پر
جو روٹی کو گھسیٹ، گھسیٹ کر
پورے دن کے
بھوکے بچے کے پاس لے کر آئیں
تم ایک گیت
گاؤں پہ اُترتی اُس شام پہ گانا
جب
گاؤں کی چکی کی کوکو
اور، آموں کے پیڑوں میں چھپی کوئل کی کوکو
ایک ہی غزل کا مطلع بن کر جھٹپٹا تخلیق کرتی ہے
تم میری خاطر
ایک گیت
اُس کتاب کے لیے بھی گانا
جس میں

لکھنے والوں کی خودکشیاں

اور

قتل کی روداد یں

انہی کے خون سے لکھی گئی ہیں

☆☆☆

گھوڑے کی کاٹھی اور تکیہ

میں
تکیے پہ سر رکھ کر نہیں سوتا
مبادا
خواب سمیت، تکیے پہ مر جاؤں
سائیکل کے پنکچر سے آئی موت
میت یا میت بغیر گھر آئے
گھر میں صرف رونا دھونا ہی ہوتا ہے
میں سمندر پہ جمی برف پہ
سکیٹنگ (Skating) نہیں کرتا
مبادا
بھوکی آبی مخلوق میری منتظر ہو
میں
آزادی کی زندگی سے بھرے

خونی نعرے سمیت

سڑک پہ جمنا چاہتا ہوں

پتھر میری کنپٹی پہ لگے

یا

عین ماتھے کے درمیان

میں اور وہ

آٹھ مارچ کا پرچم نہیں چھوڑیں گے

آخری لڑائی میں

میرا پاؤں رکاب میں پھنس جائے

میں روند ڈالا جاؤں

ایسا مرنا مجھے پسند ہے

جیسے

گھوڑے کی کاٹھی پہ بیٹھا

سپاہی لڑتے لڑتے ہلاک ہو جاتا ہے

سو

میں تکیے پہ سر رکھ کے نہیں سوتا

پنکچر شدہ سائیکل اور کچنار کا درخت

تم
میری وہ نظم ہو
جسے میں لکھتا رہتا ہوں
جب تم مجھے
مشکل سے بھی یاد نہیں آتی
تم
میرا وہ جام ہو
جو میں پیتا رہتا ہوں
اُس وقت کو یاد کر کے
جب ہم
الگ، الگ میزوں پہ بیٹھے
پی رہے ہوتے تھے

تم

میرا کچنار کا وہ پھول ہو

جسے میں نے تمہارے بالوں میں

لگانے کا سوچا تھا

جب میں کچنار کے پھولوں پہ لیٹا

تمہیں سوچ رہا تھا

بہت عرصے سے

پنکچر شدہ سائیکل

کچنار کے اُس درخت کے ساتھ لیٹی ہے

جس کے نیچے شیلے کو پڑھتے ہوئے

میں نے پہلی بار

کسی سے محبت کرنے کا سوچا تھا

اور تم

کروشیے کے رومال میں لپٹی

نیاز کی پلیٹ لیے

ماں کے کمرے کی طرف جا رہی تھی

صبح کی پہلی
تمباکو نوشی کے لیے
میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا
تو
سگریٹ کی ڈبیا
نظم، جام، کچنار کا درخت
پنکچر شدہ سائیکل
میں اور تم
کچھ بھی کہیں بھی نہیں تھا

☆☆☆

ٹوٹے دندانوں والا کنگھا

ہم
پھٹی بدبودار جرابیں نہیں بدلتے
ہم
پھٹی بدبودار بنیان نہیں بدلتے
ہم
ٹوٹے دندانوں والا
کنگھا نہیں بدلتے
مگر
خود کو خوبصورت دیکھنے کے لیے
ایک پیاز، ایک ٹماٹر، ایک لہسن
اور
ایک روٹی کم کھا کر

جمع کرتے رہتے ہیں پیسے

تا کہ

ہر روز خرید سکیں نیا آئینہ

اور

پرانی، بدبودار، گھسی

اور ٹوٹی چیزوں سمیت

خود کو دیکھ سکیں اس میں خوبصورت

☆☆

کھارے پانی کی برف

کھارے پانی کی برف
اس محبت کی طرح ہوتی ہے
جو بس اندر ہی اندر
چرکے لگاتی رہتی ہے

وہ عورت
منرل پانی سے بنی
برف کی ڈلی جیسی ہے
بہت عرصہ ہوا
میں برف کا استعمال نہیں کرتا
مگر
کسی نہ کسی محفل میں

کوئی نہ کوئی

مِنرل پانی سے بنی

برف کی ڈلی جیسی عورت

برف سمیت جام بڑھا دیتی ہے

جام میں پڑی برف کی ڈلی

اتنی حسین لگتی ہے

کہ

جیسے ہی مشروب اور برف ایک ہوتے ہیں

میں بوٹم اپ کر لیتا ہوں

بس پھر

کھارے پانی سے بنی برف کی ڈلی

میرے اندر

چرکے لگاتی رہتی ہے

☆☆☆

سیڑھی پہ بنا گھر

بارش
آسمان سے زمین تک
زمین سے آسمان تک جانے کی
ایک سیڑھی ہے
ہمارے کھیتوں میں
لگی سیڑھی کو
سانچوں میں ڈھالے گئے
وقت کی دیمک کھا گئی ہے
ہم نے سال ہا سال
اپنی زمینوں پہ
کبھی بارش کے بلبلے بنتے نہیں دیکھے
وہ بارش کہاں گئی
جو کھیت میں کھڑی

ایک عورت پہ برستی

تو

کھیتوں میں قہقہوں کی

بوچھاڑ ہو جاتی

زمین اور عورت کی خوشبو کا فرق مٹ جاتا

وہ عورت کہاں گئی

جو بارش میں

زندگی کو نہلا دیتی تھی

میں نے فیصلہ کیا ہے

اب کے بارش میں

وہ عورت اور میں

بارشی سیڑھی کے عین درمیانی زینے پر

ایک گھر بنائیں گے

بارشی سیڑھی کے عین درمیانی زینے کے اوپر سے

بارشی سیڑھی کے عین نیچے سے

خود کو الگ کر لیں گے

☆☆☆

طبعی موت سے خالی چوک

ماں کے رحم میں
خودکشی اور میں
ایک ساتھ رکھے گئے
خودکشی

میرے اور ماں کے خون سے
رحم میں میرے ساتھ پلتی رہی

میں اور وہ
جڑواں اور یتیم بچے تھے

ساری عمر
ہم محنت مزدوری کر کے
ایک دوسرے کو پالتے رہے
ملک..... طبعی موت سے
خالی ہوتا جا رہا ہے
ہر تیسرا گھر
طبعی موت سے خالی ہے
سب پازیبیں ٹوٹ چکیں
اور
پاؤں کے بغیر دفن ہو رہی ہیں
ادھ کھائے سیبوں سے
زمین اٹی پڑی ہے
ریل کار بغیر انجن کے
کمر تک اُگی گھاس میں
بغیر پلیٹ فارم کے کھڑی ہے
لگتا ہے
سنسان گلی، چوک اور محلے میں

خودکشیوں کے ڈاکے پڑنے والے ہیں
اس سے پہلے کہ سناٹے کی
تیز بارش سے راستے بند ہو جائیں
مجھے جلدی جلدی گھر پہنچ جانا چاہیے
میں اپنی خودکشی
کسی کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا

☆☆☆

''تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ''

پرندے میرے بغیر
اُڑ جاتے ہیں
اُن آسمانوں کی طرف
جو میں نے بنائے تھے
خوابوں میں
میرے پاس نہ اب پرندے ہیں
نہ آسمان ہے
اور
نہ خواب ہے

میرے پاس اب صرف ایک کتاب ہے
جس نے مجھے سکھایا

پرندے بنانا

آسمان بنانا

اور

خواب دیکھنا

☆☆☆

نوٹ : نظم کا عنوان غالب کی ایک غزل کے ایک مصرعے سے لیا گیا ہے

سرگوشیوں کا قبرستان

ہفتے میں چھ سات بار نہیں
تو
چار پانچ بار میں
گول گپے کھا ہی لیتا ہوں
کھٹائی کے بغیر
بدن ٹوٹنے لگتا ہے
مجھے گول گپے پسند ہیں
محض اس بنا پر
ایک دن اُس نے کہا تھا
''آؤ گول گپے کھاتے ہیں
مجھے گول گپے پسند ہیں''

سرگوشی میں بات کرنا
مجھے اُس کے کان نے سکھایا

کئی بار لطف لینے کے لیے
سانس روک کر میں نے
اُس کے کان میں سرگوشی کرتے کہا
''کیا میں پانی پی آؤں''
سرگوشی اور خوش فہمی
جڑواں بہنیں ہیں
اُس نے میرے کان میں
سرگوشی کرتے کہا
''مجھے تم سے بہت محبت ہے''
حالانکہ اُس نے کہا تھا
''ہاں تم پانی پی آؤ''

جب وہ میرے کان میں
سرگوشی کرتی ہے
بہتا پسینہ

میری کمر پہ گدگدی کرنے لگتا ہے
سرگوشیاں کرنے سے
خزاں
اپنے حسن کی فسوں انگیزی
آپ پر وارد یتی ہے
دنیا
سرگوشی کے علاوہ
بات کرنے کے دوسرے طریقے
مجھے سکھانے پہ کیوں تلی ہوئی ہے
کیا میری پیدائش کا مقصد
بات کرنے کے مختلف طریقے سیکھنا ہے
اگر مجھے علم ہوتا
دنیا ایک دن
سرگوشیوں کا قبرستان بن جائے گی
تو
میں اپنی سرگوشی سمیت
پیدا ہونے سے انکار کر دیتا

سیاہ راتوں کا نیلا خواب

میں نے خواب میں
نیل کنٹھ دیکھا
جو
نیلے گھوڑے اور نیلے خرگوش سے
اٹکھیلیاں کرتے ہوئے
بہار کا گیت گنگنا تا تھا
میں نے
میز کی ساری درازیں
خالی کر دیں
مگر مجھے کہیں نیلا رنگ نہیں ملا
میں نے
سارے وارڈ روب خالی کر دیے
میرا کوئی اسکارف، ٹائی، شرٹ

تھری پیس سوٹ، جرابیں
حتیٰ کہ
زیرِ جامہ بھی نیلا نہیں ملا

مگر..... یہ خواب
مجھے کسی ایسی یاد کی یاد دِلاتا ہے
جو کبھی تھی ہی نہیں
میری زندگی گھڑی سے بھی تیز تر چل رہی ہے
اور
جگراتا چاروں اور پھیلا ہوا ہے
میری بہت سی نظمیں
ادھوری ہیں
میں تو سوتا ہی اپنی نظموں کے لیے ہوں
میری نظمیں
خواب میں مکمل ہوتی ہیں
میری کسی نظم میں
نیل کنٹھ، نیلا گھوڑا

اور نیلا خرگوش نہیں ہے

کیا میں

سارا گھر، سارے کپڑے

ساری نظمیں نیلی کرالوں

یا

نیلے رنگ کے ساتھ

خود کو دفن کرالوں

☆☆☆

نوٹ!

یہ نظم جرمن مصور اونزے مارک کی بنائی کئی تصویر ''نیلا گھوڑا'' سے متاثر ہو کر لکھی ہے

برف کی کیلوں سے زخمی پاؤں

(اپنے مٹھے کے نام)

میں
اکیلے میں ہنسنے سے
اجتناب کرتا ہوں

وہ عورت
دوسرے ٹوسٹ پہ
پنیر رکھنے سے پہلے پہلے
تین بار کہہ چکی ہے
''مجھے اب تم سے محبت نہیں رہی''
مگر
میں احمقانہ طریقے سے

میز پہ پڑے مجسمہ پر
پڑتی دھوپ کا زاویہ درست
سمجھتا رہتا ہوں
اکیلے میں ہنسنے سے
ہنسی کبھی کبھار
گلے میں پھنس سکتی ہے
مجسمہ پر پڑتی دھوپ کا زاویہ
غلط نکل سکتا ہے
اُس عورت کے یہ الفاظ
آئرش کافی کے ساتھ
آپ کے اندر تیر سکتے ہیں
''مجھے اب تم سے محبت نہیں رہی''

محبت کرنے کے اتنے جواز نہیں ہوتے
جتنے محبت نہ کرنے کے
اگر کوئی ہم سے
اپنی محبت واپس مانگ لے

تو ایسے لگتا ہے

وہ

ہمارے پاؤں سے بُوٹ اتروا کر

ننگے پاؤں

تیز دھار برف پر چلتے ہوئے

پلٹ جانے کا کہہ رہا ہے

جب سے اُس عورت نے

اپنی محبت واپس مانگی ہے

میں

برف میں کھڑا ہوں

اور پاؤں

برف کی کیلوں سے زخمی

بوٹوں میں محفوظ ہیں

☆☆☆

دوسری زبان میں سُنی گئی افواہ

(نازیہ نگارش کے نام)

خواب دن بھر
میرے چار چفیرے رہا
میں
جراب کا دایاں پاؤں
پلنگ کے نیچے
اور
درازوں میں ڈھونڈتا رہا
اور

خواب میرے چارچفیرے رہا
میں آئیریش کافی بناتا رہا

اور

خواب میرے چارچفیرے رہا
میں سارے مصالحوں کی شیشیاں نکال کر
درازوں میں جمی ہلدی کھرچتا رہا

اور

خواب میرے چارچفیرے رہا
مگر میں ایسے خواب
جگراتے کے تابوت میں لٹا کر
دفنا دیتا ہوں
میں نے کوئی نیند
خواب کے بغیر
کسی بستر پہ نہیں سوئی
چاہے وہ
جگراتے کی نیند ہی کیوں نہ ہو
افواہ اور خواب

کسی دوسری زبان میں سننا

ایسے ہے، جیسے

مختلف سائز کے کنکر

کوئی تمھارے منہ میں ڈال دے

میں خزاں کے موسم میں

جنگل جانے سے اجتناب کرتا ہوں

ننگے پاؤں چلنے سے بھی

خزاں زدہ خشک پتوں کی

چُرمراہٹ سے

گلہری کا خواب ٹوٹ جاتا ہے

گلہری کا خواب

تمہارے پاؤں سے ایسا چمٹتا ہے

تم ساری زندگی

اپنا کوئی ذاتی خواب

نہیں دیکھ پاتے

میں نیند میں
کسی کا خواب دیکھنا
اپنی نیند کی توہین سمجھتا ہوں

تکمیل سے پہلے کا ایک دن

ایک نامکمل شخص سے
کوئی محبت نہیں کرتا

ٹکٹ چیکر کے
ٹکٹ میں سوراخ کرنے سے
صرف تمہاری ٹکٹ ہی
آخری سٹاپ تک پہنچ پاتی ہے
تم ہمیشہ کی طرح
اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں پڑی
آرام کرسی پر

رگ سیک کو تکیہ بنائے
نیند میں پچھلے سفر کے
خواب دیکھتے رہتے ہو
تم نے ہمیشہ وہ سفر کیے
جس میں تم خود موجود نہیں تھے

اس نے مجھے بتایا
ایک دن وہ مجھ سے
محبت کرنے کا سوچ رہی تھی
مگر میں
اس دن وہ نہیں تھا
جو میں ہوں
اور جس دن میں
وہ ہوتا ہوں
جو میں نہیں ہوں
اس دن وہ
اپنی مصروفیت کی بنا پر

مجھ سے محبت نہیں کر پاتی

میں

اس کی محبت حاصل کرنے کے لیے

اور

خود کو مکمل کرنے کے لیے

دن رات جُتا ہوا ہوں

جس دن مجھے

اس کی محبت حاصل ہو گئی

اور میں مکمل ہو گیا

وہ دن میری زندگی کا

آخری دن ہو گا

☆☆☆

نوٹ: یہ نظم میں نے باسط میر کے سارتر کے فلسفہ وجودیت پہ لکھے گئے ایک مضمون سے متاثر ہو کر لکھی

نوٹ: اس نظم کو نام رفعت ناہید نے دیا

درخت کی چھاؤں جڑوں میں ہوتی ہے

میں کبھی بھی
اُس کی موجودگی میں
اُس سے محبت نہیں کر سکا
اپنے
اور اُس کے چاہنے کے باوجود بھی نہیں
اُس کی نا موجودگی میں
میں وہ درخت بن جاتا ہوں
جس کے نیچے
محبت سے بھرپور اربوں لوگ
بیٹھ سکتے ہیں

میں نے
پیدائش کے بعد سب سے پہلے

موت کی صلاحیت پہ قابو پایا

موت کا سب سے زیادہ نقصان
زندہ لوگوں کو ہوتا ہے
میں
اپنی کسی بھی موت پر
خود موجود نہیں تھا

درخت کی چھاؤں
اُس کی جڑوں میں ہوتی ہے
زمین پہ
وہ اپنی چھاؤں سے خالی ہوتا ہے
مجھے
اُس کی محبت کے لیے
خود کو نا موجود کرنا پڑے گا
میں
اپنی ایک موت میں
زندہ رہنا چاہتا ہوں

تجسّس افواہ گری کی ایک شکل ہے

وہ میرے پاس
کبھی بھی نہیں تھی
اُس وقت بھی نہیں
جب میں اس کے پاس تھا
اُس نے کہا
''آؤ ہم محبت پہ بات کرتے ہیں''
میں نے رات کے کبابوں کے لیے
پیاز کاٹتے اُسے کہا
''کل میں نے
جیکٹ اور گرم دستانے خریدنے جانا ہے

شاپنگ پلازہ کے کافی ہاؤس میں
بیٹھ کر بات کریں گے
میں نے دوسرا پیاز کاٹتے
اور
تیسرا گلاس اپنے اندر اُنڈیلتے
خود سے بات کرنے کی کوشش کی
مگر.....مگر میرے پاس
خود سے بات کرنے کو کچھ نہیں تھا
میں جو اپنے اندر
خود رہائش نہیں رکھتا
میں کسی اور سے
محبت کیسے کر سکتا ہوں
میں اُس کے متعلق
جتنا زیادہ تجسّس کرتا ہوں
محبت مجھے افواہ گری کی
ایک شکل لگتی ہے

میں نے سوچا

چلو پریشانی، کرب اور اضطراب میں

رہنا شروع کرتا ہوں

پریشانی، کرب اور اضطراب

بندے کو خود سے ملا دیتے ہیں

سنتوشی میں

بندہ خود سے بیگانہ

اور

خود سے الگ ہو جاتا ہے

آئینے میں جنم لیتا آدمی

میں ایک ہزار سال سے
خود کو بنانے کی کوشش کرتا رہا
آخر تنگ آ کر
میں نے پیدائش سے پہلے
ایک آئینہ بنایا
اور
خود کو اس میں جنم دیا
میں نے آئینے کو
وہ سب کچھ کہہ دیا
جو پیدائش نہ ہونے کی وجہ سے
خود سے نہیں کہہ سکا تھا
میں نے
آئینے سمیت خود کو
بالکونی میں پڑے مور پنکھ کے گملے میں اُگا یا

اور

پتّیوں کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر

پتّیوں کے ہونٹوں پر اپنی کہانی لکھ دی

اب میری چائے کی بھاپ میں

کوئی خالی پن نہیں

وہ جو میرے پاس

ایک ہزار سال سے نہیں تھی

اب وہ

کہیں بھی نہیں ہے

سوائے میرے

میں جو کبھی بھی، کہیں بھی نہیں ہوں گا

سوائے

آئینے، گملے کی پتی

اور

چائے کی بھاپ میں

☆☆☆

میں درخت کو کچھ نہیں دے سکتا

(اپنے مٹھے کے نام)

درخت
سب سے زیادہ
خواب دیکھتے ہیں
خزاں میں بھی
جب اُن کی برہنہ ٹہنیاں
کسمسا کر رقص کرتی ہیں

میرے دل میں
اُس کی محبت

اور

خوف ایک ساتھ پیدا ہوئے

مگر۔۔۔۔۔۔۔ میں

درخت کے نیچے بیٹھنے کے سوا

درخت کو کچھ نہیں دے سکتا

میں کبھی بھی

تنہا نہیں ہوا

سوتے ہوئے بھی نہیں

ایک نیند میں

میں نے ایک خواہش کی تھی

میں نے ساری محبتیں، خواہشیں

اور

نظمیں نیند میں لکھیں

میں اُس سے

یک دم جدا نہیں ہوا

میں نے پہلے
اُداسی سے ملنے کا اہتمام کیا
چھٹی کے دن
زرد اسکارف پہلے
انگلیوں میں سُلگتا
ہوانا کا سگار پکڑے
میں اُن علاقوں میں گیا
جہاں
چھٹی کے دن
گوداموں کے اندر
چوہوں سے کُتری بوریوں کے اوپر
ریلوے یارڈ کی
ورکشاپ کی دیوار کے ساتھ ٹنگی
ڈانگریوں کے ٹوٹے بٹنوں پر
اور
آس پاس کی تاریک گلیوں کے
پبوں کی میزوں پہ پڑے

خالی اور ادھ خالی گلاسوں کے

بیچوں بیچ اُداسیاں

ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے

ٹینکو اور بگ ڈانس کر رہی تھیں

لگتا ہے

کوئی درخت میرے

نیچے آ بیٹھا ہے

☆☆☆

کافی کے آخری گھونٹ میں ملی محبت

بہت عرصے سے
میں ہر روز اس سے
لاحاصل محبت کرتا رہا تھا
ایک دن
میز سے اس کا
کافی کا کپ اُٹھاتے
میں نے سوچا
یہ لاحاصلی ہی کہیں
میری محبت نہ بن جائے

پیوند کاری کیے گئے
درخت کی چھاؤں جھلتی دھوپ سی ہوتی ہے

خودکشی کیا کوئی

فلسفیانہ مسئلہ ہے؟

زندگی کبھی بھی خودکشی نہیں کرتی

خودکشی

ہمیشہ موت کی ہوتی ہے

میں اپنی موت

کبھی خودکشی کے ہاتھ

لگنے نہیں دوں گا

میں کافی کا تازہ کپ

اس کے ساتھ پیتے

اپنی موت کو

خودکشی کی طرف جانے سے پہلے

کافی کے آخری گھونٹ میں

اس کی محبت حاصل کرلوں گا

☆☆☆

برفیلے پانی میں تیرتا استعارہ

میں چاہتا ہوں
وہ میرے ساتھ
استعاروں میں محبت کرے
مجھ سے علامتی محبت کرے
اور
میں ساری عمر
اس کی استعاراتی
علامتی محبت میں
استعارے
اور علامتیں تلاش کرتا رہوں
سپاٹ محبت
اخبار میں چھپی خبر کی طرح ہوتی ہے

شام کو دوکان دار جس میں
سموسے ڈال کر گاہکوں کو دے رہا ہوتا ہے

میں جب بھی
اُس سے محبت کا اظہار کرتا ہوں

وہ
فُل سپیڈ پیڈسٹل چلا کر
برفیلے پانی سے بھرے
ٹب میں لیٹ کر گھنٹوں
نہاتی رہتی ہے
اس عرصے میں
سرخ وائن اور میں
اس کی اس علامت میں سے
اور علامتیں تلاش کرتے رہتے ہیں

☆☆☆

ایک بے عمرا آدمی

بغیر خواب کے
نیند لینے سے بہتر ہے
درخت کی چھاؤں سے پرے ہو کر
درخت کو اُس وقت تک
دیکھا جائے
جب تک اُس میں سے درخت نظر نہ آئے

میرا کچھ حصہ
ہمیشہ مجھ سے باہر رہا
میں
اُسے اندر لانے
اور
اپنے کچھ بے کار حصوں کو
خود سے باہر نکالنے میں

مصروف رہتا ہوں

باقی وقت

کونیاک ملی بلیک کافی

پیتے یہ سوچتا رہتا ہوں

کیا میں

نامکمل ہوں؟

کیا میں

بے عمر اہوں؟

آؤ

ہم خوابوں کے بغیر نیندوں کو

اور

بے کار حصوں کو

خود سے باہر نکال کر

کونیاک ملی کافی پیتے

اپنے اندر

خالی حصوں کو پُر کریں

میں نے خودکشی کیوں ملتوی کی

میں
دیر تک کھلے رہنے والے
شراب خانوں
اور
چائے خانوں کو پسند کرتا ہوں
شراب خانوں
اور
چائے خانوں میں بیٹھے لوگوں سے مجھے
لایعنی گفتگو کرنا اچھا لگتا ہے
بہ نسبت
کھردرے بستر پر
کھردری لایعنی نیند کے لیے

آدمی خود کچھ نہیں ہوتا

رات کی جاگتی سڑکیں
زرد روشنی دیتے بلب
سبزی منڈی اور مذبح خانے کو
جانے والی گاڑیاں
آدھے فٹ پاتھ
اور.....آدھے سڑک پہ سوئے شرابی
دن بھر کے شور سے تھکے
سوئے ہوئے فٹ پاتھ
لگژری ہوٹلوں کے شیشوں پہ
ناچتے سائے
اور
بنا دروازے عالم کافی ہاؤس کی
کسیلی چائے کی مہک
آدمی کو زندگی دیتی ہے

میں

جب بھی خودکشی کا سوچتا ہوں

میں

شراب خانے کی بالکونی میں

مخصوص کونے میں جا بیٹھتا ہوں

جہاں

بالکونی کے ہمسائے کے درخت

مجھ پہ سایہ کیے رکھتے ہیں

ویٹر

جب مجھے آخری برانڈی

دینے سے انکار کر دیتا ہے

تو

اُس سے اگلے دن

برانڈی حاصل کرنے کے لیے

مجھے

خودکشی ملتوی کرنی پڑتی ہے

☆☆☆

اسکارف کی گرہ میں بندھی محبتیں

پرندہ

ہوا کو چیرتا

اپنی اُڑان کا جشن منا رہا ہے

پرندہ

اپنی اُڑان کو

ہوا کی موت

اور

اپنی اُڑان کو زندگی سمجھتا ہے

مگر

پرندے کے پر جانتے ہیں

ہوا کی موت

پرندے کی موت ہے

جو مجھ سے بچھڑ جائے

میں
اس سے کبھی نہیں بچھڑتا
چاہے وہ کبھی بھی، مجھ سے نہ ملے

محبت تشکیل ہوتی ہے
محبت تکمیل ہوتی ہے
اور
الگ ہو جاتی ہے
سنو!
ایسی محبت کو
واپس لانے کے لیے
اُسے ہر لمحہ
اپنے ساتھ رکھنا پڑتا ہے

واپس آئی محبت
کبھی اکیلی
اور پہلے جیسی نہیں ہوتی
تم سے بچھڑ کر اُس نے

جتنی محبتیں کی ہوتی ہیں

وہ سب محبتیں
اپنے بندھوں میں لٹکا کر آتی ہے
تم بھی اُس کے بغیر
درختوں میں کھدی محبتیں
گلابی رنگ کے
اسکارف کی گرہ میں باندھ کر
اُسے ملتے ہو
ایک دوسرے کے بغیر کی گئی محبتیں
تجدیدی محبت کو نیا
اور
زندہ کر دیتی ہیں
محبت، ہوا اور پرندہ
کبھی نہیں مرتے

☆☆☆

میں کبھی بھی ''میں'' سے نہیں ملا

میں
جب پیدا ہوا
میں نے پہلی چیخ
محبت، وقت
اور
موت کی تکون کے خلاف ماری
یہ تکون بچے کو
بغیر پیدا ہوئے
موت کی تہہ میں
لپیٹ کر لے جاتی ہے

میں بہت سے ادھ پیے
گلاسوں میں چھوڑی شرابیں
پی پی کر

بسوں اور ٹرینوں کے
نیچے آتے آتے بچا
مگر
میں نے ساری بوتل پی کر
دوستوں کو
بسوں اور ٹرینوں کے
نیچے آنے سے بچا کر انہیں
ان بستروں پہ پہنچا تا رہا ہوں
جہاں
تنہائی ہم بستری کر رہی تھی

میں
محبت، وقت اور موت کے
خون ریز مقابلے میں
پیدا ہوا اور مارا گیا
میں کبھی بھی
میں سے نہیں ملا

☆☆☆

موت کے بعد کیا گیا ٹینگو ڈانس

میں نے
کبھی کسی سے نہیں کہا
"مجھے تم سے محبت ہے"
یہ کہنے سے پہلے
مجھے خود کو یقین دلانا پڑے گا
کہ ۔۔۔۔۔۔۔ میں ہوں
اس کے لیے کسی اور کا ہونا ضروری ہے
جو میرے ساتھ ٹینگو ڈانس کر سکے

اور

ٹینگو ڈانس کے تیسرے سٹیپ پہ

میرے کان میں سرگوشی کر کے کہے

ہاں۔۔۔۔۔تم ہو

میں بار میں بجتی آخری دُھن پہ

اپنا بایاں ہاتھ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈالتے

اور

اپنا دایاں بازو اس کی کمر میں ڈال کر

اس کی گردن اور کان کے قریب ہو کر کہوں

"آؤ ! ہم محبت کریں"

کیا یہ علم ہو جانا

کہ ۔۔۔۔ میں ہوں

میری موت ہے؟

میں ایسا نہیں سمجھتا

مجھے پتا چل جانا

کہ ۔۔۔۔ میں ہوں

میری موت کی موت ہے

میری زندگی وہ ہے
جس نے مجھے کہا
"ہاں! ۔۔۔۔۔تم ہو
ہم مرنے کے بعد بھی
ٹینگو ڈانس کرتے رہیں گے

☆☆☆

آئینہ میں جنم لیتا آدمی

مسعود قمر

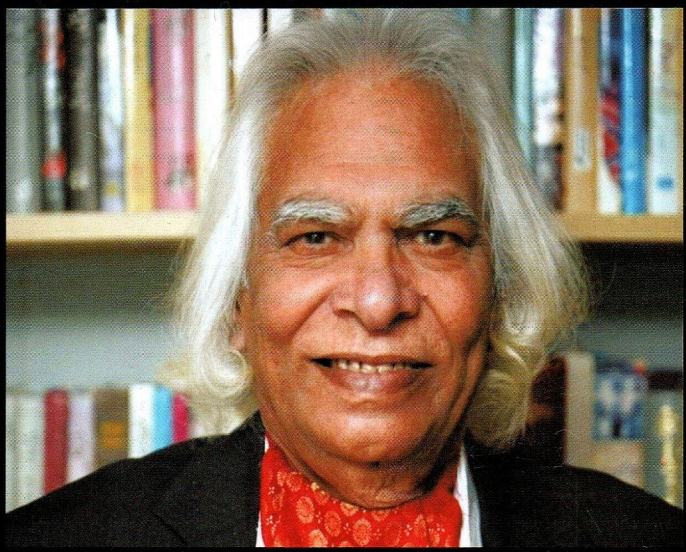

مسعود قمر کی نثری نظمیں، اس قدر ''نئی، انوکھی، عجب، طرفہ'' ہیں کہ انہیں پڑھنے اور سراہنے کے لیے آپ کو شاعری کے عمومی تصورات کو معطل نہیں، برابر پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے، تاکہ ان کی شکست کی جا سکے۔ ان نظموں کی ہر ہر سطر، ایک اعتبار سے شاعری کے اس عمومی تصور کے خلاف قہقہہ کی ماند ہے، جو ہماری حسِ لطیف کو مخاطب کرتی ہے اور ہمیں ملکوتی احساس، حسن سے شرابور کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظمیں روایتی و عمومی شعری جمالیات کا باقاعدہ تمسخر اڑاتی محسوس ہوتی ہے اور اسی تمسخر کے دوران ہی میں وہ اپنے ''طرفہ شاعری'' ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ طرفگی یا Marvellousness ان نظموں کے اسلوب کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ لیکن یہ طرفگی اچھی خاصی صدمہ انگیز بھی ہے ان نظموں کے امیج، استعارے، تمثیلیں، سب ہماری عمومی توقعات اور کئی جگہوں پر اخلاقیات کو صدمہ پہنچاتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں نہ تو نامیاتی ترتیب نام کی کوئی چیز ہے۔ نہ منطقی تسلسل اور نہ کوئی واحد مضمون جو ابتدا وسط و انجام تک، تسلسل یا خلا کے ذریعے مکمل ہوتا ہو۔ اس کے باوجود یہ کسی انتشار کو پیش نہیں کرتیں۔ کیا ضروری ہے کہ جہاں منطقی ترتیب نہ ہو، وہاں لازماً انتشار ہو۔ وہاں کوئی اور حالت، تعطل، وقفے اور حرکت کی ملی جلی حالت ہو سکتی ہے۔ یہ اپنی بے ترتیبی سے ایک ''نیا، روزمرہ منطق کو شکست دیتا نظم'' وجود میں لاتی محسوس ہوتی ہے۔

ناصر عباس نیّر

سائبان تحریک، 249، جی ماڈل ٹاؤن لاہور 0300-4375871
saibantehrik@gmail.com | www.saibantehrik.com

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪانئُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، ٻَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَ پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَ سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جڻ جڻ جاڙ وڏي تي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موتي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اٽڃاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)